شنائی کا کرب
ارمان شمسی

آشنائی کا کرب

(افسانے)

ارمان شمسی

ناشر

بیسویں صدی میگزین۔ آئی۔۳، مُرادی روڈ۔ بٹلا ہاؤس۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵۔۱۱۰۰

نام کتاب : آشنائی کا کرب

مصنف : ارمان شمسی

سنِ اشاعت : ۲۰۰۳ء

تعدادِ اشاعت : ۵۰۰

قیمت : ۱۵۰ روپے غیر ممالک کے لیے ۱۰ ڈالر

کاتب : شمیم قمر گیاوی

ناشر : بیسویں صدی میگزین۔ آئی۔۳، مُرادی روڈ

بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

مصنف کا پتہ : ۴۸ رفرینڈشپ مارکیٹ چوک، سرکلر روڈ۔ ڈھاکہ۔ بنگلہ دیش

تقسیم کار : بیسویں صدی میگزین۔ آئی۔۳، مُرادی روڈ

بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

انتساب

آہنی عزم

بے پناہ ہمت

اور

چٹانوں جیسے بلند ارادوں والی

پیاری بیٹی

بیرسٹر سعدیہ ارمان

کے نام

AASHNAI KA KARB———Afsaney———Armaan Shamsi

Published by:
BISWIN SADI MAGAZINE
I-3, Muradi Road, Batla House
New Delhi-110025

فہرست

۱۔ ارمان شمسی کے افسانے	اظہار اثر	۲
۲۔ مصنف کے بارے میں	ڈاکٹر شمع افروز زیدی	۷
۳۔ حرفِ آغاز	محمد ارمان شمسی	۸
۴۔ منجدھار		۹
۵۔ رکھیل		۲۱
۶۔ جیون ایک الاؤ		۲۹
۷۔ بھونچال		۵۱
۸۔ مہک		۵۷
۹۔ آشنائی کا کرب		۶۵
۱۰۔ میڈم راسپوٹن		۸۱
۱۱۔ جواب		۹۳
۱۲۔ درد کی تنہائیاں		۱۰۳
۱۳۔ روشن دان		۱۱۶
۱۴۔ جھوٹن		۱۲۳
۱۵۔ چھوٹا گھر		۱۳۰
۱۶۔ گلچیں کا خمار		۱۳۹

ارمان شمسی کے افسانے

آپ گلستاں کی سیر کر رہے ہوں تو آپ کو طرح طرح کے خوشنما پھول نظر آئیں گے جن میں سے ہر پھول آپ کا دل موہ لے گا۔ لیکن اگر آپ کسی بے آب و گیاہ صحرا سے گذر رہے ہیں جہاں میلوں تک سبزہ نظر نہیں آتا وہاں اچانک آپ کو چند پھول نظر آجائیں تو آپ کو پھولوں کی اصل قدر و قیمت کا احساس یقیناً ہوگا۔

بالکل یہی احساس بنگلہ دیش کے ان افسانہ نگاروں کو پڑھ کر ہوتا ہے جو اُردو میں افسانے لکھ رہے ہیں۔ چوں کہ بنگلہ دیش میں اُردو کو تقریباً ختم کر دیا گیا ہے اس لیے وہاں کے افسانہ نگار اپنی تخلیقات ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع کرا کے اُردو سے اپنی محبت کے جذبے کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔ ارمان شمسی بھی بنگلہ دیش میں رہتے ہوئے اُردو میں افسانے لکھتے ہیں اور ہندوستان کے رسائل میں شائع ہونے کے لیے بھیجتے رہتے ہیں۔ لیکن تخلیق کار کہیں کا بھی رہنے والا ہو اس کا اصل تعارف تو اس کی تخلیق ہوتا ہے اور اس کی تخلیقات قارئین کو دوہرا متاثر کرتی ہیں۔ انسان کسی دیس میں رہتا ہو، کوئی سی بھی زبان بولتا ہو لیکن جب وہ کوئی تخلیقی کام کرتا ہے تو زبان اور ملکوں کی سرحدیں ٹوٹ جاتی ہیں صرف تخلیقی ذہن کی گلکاریاں باقی رہ جاتی ہیں۔ ارمان شمسی کے افسانے اس نظریے کے ثبوت کے بطور آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ وہ کہانیوں کے ذریعے اپنے معاشرے کی تلخیوں اور انسانی محسوسات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ یہ افسانے زندگی کے تلخ و ترش تجربات و مشاہدات کا آئینہ ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔

اظہار اثر

مصنّف کے بارے میں

محمّد ارمان ۲۱/اگست ۱۹۴۵ء کو قصبہ آنولہ ضلع بریلی (یو۔پی) میں ایک تجارت پیشہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف تین برس کے تھے کہ والد محترم کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد زندگی نہایت کسمپرسی میں گذری یتیمی کے دور سے لے کر بڑے ہونے تک طرح طرح کے مصائب اور اذیتیں برداشت کیں، بے شمار دکھ جھیلے ہجرت کے سانحے سے بھی دوچار ہوئے۔ عشق کی ناکامی کا زہر بھی انھیں پینا پڑا۔ غرض قدم قدم پر آزمائشوں کی بھٹی میں کچھ اس طرح بار بار تپے کہ کندن بن کر ابھرے اور ان تمام آزمائشوں کے نتیجے میں محمّد ارمان، ارمان شمسی کے نام سے ادبی اُفق پر اس طرح نمودار ہوئے، ایسا قلم ہاتھ میں تھاما کہ آج تک وہ قلم اسی رفتار سے رواں دواں ہے اور صفحۂ قرطاس پر تمام تر جولانیوں کے ساتھ کہانیاں رقم کرتا جا رہا ہے۔ ادبی زندگی کی ابتدا ''بھوک کا شکنجہ'' کہانی کے ذریعہ کی اور جب یہ کہانی ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی میں شائع ہوئی تو کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ کہانی کسی نوسیکھیے نے لکھی ہے۔ اور حُسنِ اتفاق ہے پہلا افسانوی مجموعہ بھی ادارہ بیسویں صدی ہی شائع کر رہا ہے۔ ادبی شوق اگرچہ ان کا جز وقتی مشغلہ ہے لیکن کتنا خوبصورت مشغلہ ہے کہ اب تک ارمان شمسی ساٹھ سے زائد کہانیاں قارئین کے سپرد کر چکے ہیں۔ ''آشنائی کا کرب'' ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ضرور ہے لیکن ان کا سفر مسلسل جاری ہے۔ عنقریب دوسرا مجموعہ بھی وہ قارئین کو دیں گے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں میں ارمان شمسی نے جنسیت کا اظہار کہیں بہت

کھل کر کیا ہے تو کہیں اشاروں کنایوں میں لیکن جنس کو انھوں نے ذہنی تلذذ حاصل کرنے کے بجائے صحت مند طریقے سے برتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں معاشرے اور سماج سے جڑے ہوئے مسائل بھی ہیں اور اس میں رونما ہونے والی ایسی حقیقتیں بھی جو ہماری روزمرہ زندگی میں درپیش ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کا مواد زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اخذ کیا ہے۔ انداز بالکل سیدھا سادہ ہے۔ وہ اپنے قاری کو کسی الجھن کا شکار نہیں ہونے دیتے نہ انھیں ابہام میں مبتلا کرتے ہیں۔ زبان عام فہم اور سادہ استعمال کرتے ہیں۔

غرض بے شمار مصائب و مسائل سے دوچار ہونے کے بعد ارمان شمسی اب اللہ کے فضل و کرم سے ایک فیکٹری کے مالک ہیں۔ معاشی اعتبار سے مستحکم ہیں اور بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ان کے مزاج میں کچھ ایسی جستجو بسی ہوئی ہے کہ طبیعت مثلِ پارہ ہر دم نئی جہتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ ان کا وجود اقبال کے اس شعر کے مصداق جہدِ مسلسل کا عملی ثبوت ہے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

شمع افروز زیدی
۱۹ر اگست ۲۰۰۳ء

حرفِ آغاز

کہتے ہیں ادب ایک آئینہ ہے جس میں ہمارے سماج کی ظاہری شکل وصورت ہی نہیں باطن بھی نظر آتا ہے۔ یہ باطن کیا ہے؟ انسانی سرشت، جس کا بیشتر حصّہ جنسی میلان پر مبنی ہے۔ جنسی انگیخت، دباؤ، ہیجان، انتشار اور احساسِ کمتری جیسے جذبوں کے چشمے اسی منبع سے پھوٹتے ہیں جو ہمیشہ ماحول میں تصادم کا باعث بنتے رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مروجہ معاشرتی اور تہذیبی عقائد کی بنا پر ہم ان معاملات پر بات کرنے سے گریز کرتے رہے ہیں، جب کہ ان جنسی رجحانات کا تعلق ہماری زندگی سے گوشت اور ناخن کا سا ہے۔

یہ دور علم وآگہی کا دور ہے ہمیں ان معاملات پر زیادہ وسیع القلبی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ضروری نہیں کہ جنس پر مبنی ایسے افسانے لکھے جائیں کہ پڑھنے والا اسے چھپ چھپ کر پڑھے اور پڑھنے کے بعد کتاب کو صندوق میں چھپا کر رکھ دے۔ ایسی ہیجان انگیز کہانیاں ہمیں فرحت نہیں پہنچاتیں بلکہ ہمارے جذبۂ قطم کو بھڑکاتی ہیں۔ ایک باشعور قاری ایسی کہانیوں کو ہمیشہ کراہیت کی نظر سے ہی دیکھے گا۔ جنسی مسائل پہاڑوں جیسے ہیں میں نے ان پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کی ہے اور تلذذ وہیجان سے دور رہ کر ان مسائل کی نشاندہی کرنا چاہی ہے، میرے خیال میں اس طرح کی کہانیاں ہماری ذہنی گھٹن میں سڑانڈ پیدا نہیں کرتیں بلکہ فشار سے نجات دلاتی ہیں۔

میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں اس کا فیصلہ آپ کیجیے گا۔

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے (میر)

ناسپاسی ہوگی کہ میں محترمہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا تذکرہ نہ کروں جن کی کرم فرمائی اور وسیلے سے میرے افکار کی رسائی آپ تک ہوئی ہے۔

میرا پہلا افسانہ ''بھوک کا شکنجہ'' بیسویں صدی مئی ۱۹۸۳ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا جب سے مبتلائے شوق ہوں اور اب تک ساٹھ افسانے صفحۂ قرطاس کی نذر کر پایا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی کاروباری مصروفیات سے زیادہ وقت ادبی خدمت کے لیے نہیں نکال سکا۔

میرا پہلا افسانوی مجموعہ جو عام سماجی کہانیوں پر مشتمل تھا پبلشر کی مہربانی سے تقریباً تین برس سے التوا میں پڑا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ دوسرا افسانوی مجموعہ ''آشنائی کا کرب'' جو یقیناً پہلا افسانوی مجموعہ ثابت ہوگا ادارہ بیسویں صدی سے شائع ہو کر قارئین کے روبرو ہے۔ چوں کہ میرا قیام اپنی تہذیبی اقدار سے دور بنگلہ دیش میں ہے اور یہاں زبانِ اُردو پر قدغن ہے پھر سماجی مسائل ایک ہیں وہ بنگلہ دیش ہو، پاکستان ہو یا ہندوستان ماحول سے دوری فکر و تخیل میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنتی البتہ زبان و بیان ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ اس بارے میں میں اپنی کوتاہی پر معافی کا خواستگار ہوں، یہاں حالات نے اُردو سے محبت کرنے والوں کو ایک گہری کھائی یا اندھے کنویں میں محبوس کر رکھا ہے۔ آپ نے غریب الوطن اور غریب الدیار جیسے محاورے سُنے اور پڑھے ہوں گے اب محبوس الوطن کا بھی اضافہ کر لیجیے۔ یہاں زبان سے متعلق کسی کرن کی رمق بھی نظر نہیں آتی۔ اُردو کی تازہ تحریر کو دیکھے ہوئے مہینوں کیا سالوں گزر جاتے ہیں۔ مطالعہ نہ ہونے سے ہمارا اسلوبِ گفتگو تک بگڑ گیا ہے اور ہمارے بچے کیا زبان بول رہے ہیں... بس کچھ نہ پوچھیے۔

ع کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ...... غالب

مخلص
ارمان شمسی

منجدھار

بڑی بانو اپنی حویلی کے لق و دق آنگن میں چٹائی پر بیٹھی دھوپ کھاتی جا رہی تھیں اور بچوں کا سپارہ بھی سُنتی جا رہی تھیں۔ سامنے قطار سے بیٹھے بچّے اپنا اپنا پچھلا سبق لہک لہک کر پڑھ رہے تھے۔ جہاں کوئی اٹکتا یا غلطی کرتا تو وہ فوراً ہی اس کو ٹوک کر تصحیح کرتیں اور پوری آیت دہرا دیتیں۔ طالب علم پھر فرّاٹے بھرنے لگتا۔ ہر روز وہ کوئی درجن بھر بچوں کی آوازوں پر کان لگائے بیٹھی رہتیں۔ گو کہ وہ حافظہ نہیں تھیں پر مہارت کا یہ عالم تھا کہ پورا قرآن شریف انھیں ازبر تھا۔

اب یہ اُن کا مشغلہ بھی بن گیا تھا اور ضرورت بھی کہ وہ دن بھر بچوں کے ساتھ سپارے رٹتی رہیں۔ کوئی آل نہ اولاد، اگلے پچھلے سب مر کھپ چکے تھے۔ حویلی میں ان کے علاوہ ان کی ایک پھوپھی تھیں، وہ بھی جب لیٹے لیٹے اُکتا جاتیں تو پاس آکر بیٹھ جاتیں اور بھول ہونے پر لقمہ دینے لگتیں۔

بڑی بانو کے شوہر صولت مرزا پندرہ سال ہوئے انتقال کر چکے تھے۔ پُرانے تعلقہ دار تھے۔ اُن کی حیات میں ہی زمینداری ختم ہونے کے بعد، پشت ہا پشت کے اقدار کی سلامتی اور شان و شوکت کے اخراجات کا بوجھ باقی ماندہ جائدادوں پر آن پڑا تو وہ روایتی خرچ کی متحمل نہ ہو سکیں۔ بات جائیدادوں کو گروی رکھنے تک پہنچی۔ پھر بات بڑھتی چلی گئی اور بھرم کو قائم رکھنے کے لیے ایک دن ایسا بھی آیا کہ زمانے کی بادِ صرصر نے سارے چراغ بجھا دیے، تمام جائیدادیں گروی ہو کر مہاجنوں کے چنگل میں چلی گئیں۔

صولت مرزا ٹوٹتے چلے گئے۔ اُن کی زندگی کے آخری ایّام میں شکستہ دلی مکمل طور

پر غالب آچکی تھی۔ ان کے انتقال پر تجہیز و تکفین اور درود و فاتحہ کے خرچ کے بعد خمیازہ کش و تہی دامن بڑی بانو پیٹ کی دوزخ کی آگ میں جھلسنے لگیں تو پرانے منیم رام بھروسے جی نے مشورہ دیا کہ رہائشی حویلی کا پچھلا حصہ کرائے پر اٹھا دیا جائے۔ پھر حویلی میں دیواریں اٹھنا شروع ہوئیں تو اٹھتی ہی چلی گئیں کیوں کہ گھر کے خرچ سے زیادہ پرانے مقدمات کے اخراجات تھے۔ منشی جی اسی آس پر اب تک مقدمے لڑنے پر بڑی بانو کو آمادہ کیے ہوئے تھے کہ شاید کامیابی مل جائے۔ رہن شدہ جائیدادوں پر اتنا سود در سود چڑھا ہوا تھا کہ فروختگی کے بعد چھٹکارہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

اب بڑی بانو کے پاس ایک دالان اور صحن باقی رہ گیا تھا۔ بقیہ تمام حویلی کرائے پر دی جا چکی تھی۔ کل تک جس کی حکومت کوسوں پھیلی ہوئی تھی آج سمٹ کر ایک آنگن اور دالان تک محدود ہو گئی تھی۔ محل نما لق و دق حویلی میں جہاں ماما ئیں اور کنیزیں چہلیں کرتی پھرتی تھیں، وہاں سناٹے کی حکمرانی تھی۔ آوازیں تھیں تو جنگلی کبوتروں کی جو منڈیروں پر بیٹھے غٹرغوں کرتے رہتے تھے۔ کل تک جس کے ایک اشارے پر آسمان سے تارے توڑ کر لائے جا سکتے تھے آج وہی ہستی دن دن بھر بیٹھی منیم جی کی آمد کا انتظار کیا کرتی تھی۔ وہ آئیں تو سودا سلف لادیں۔ جو جسم پھولوں کے بستر پر آرام کا عادی تھا، آج کھردرے پلنگ پر گزارہ کر رہا تھا، لیکن بڑی بانو ہمیشہ کی سمجھدار اور صابر تھیں۔ انھیں معلوم تھا ان کے مقدر کا ستارہ اپنی تابناکی کھو چکا ہے تو اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟

منیم جی پرانی روایات پر کاربند ایک مخلص انسان تھے۔ شرافت ان کی وضع تھی ہفتے میں دو تین پھیرے وہ حویلی کے ضرور لگاتے۔ سودا سلف لا دیتے۔ پردے میں رہ کر مقدمات کی پیشی کی کارروائیاں سناتے، کرایہ وصول کرتے اور اخراجات کا حساب دیتے۔

مقدمات کے اخراجات سے جو کچھ بچ رہتا وہ بڑی بانو کے مصارف کے لیے کافی ہوتا ویسے بھی وہ قناعت پسند تھیں۔ اسراف سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ گزر بسر ہو ہی رہی تھی اب تو انھیں عاقبت کی فکر تھی سو اس کے لیے وہ جی جان سے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔

بچے جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے کہ ڈیوڑھی پر کھٹکا ہوا۔ ایک لڑکا دوڑ کر ڈیوڑھی پر گیا

واپسی پر اس نے کہا "آپ کو بلا رہے ہیں کچہری سے کوئی آیا ہے۔"

یا الٰہی خیر! پری بانو دوپٹہ سنبھالتی، سلیپر سٹر سٹر کرتی ڈیوڑھی تک پہنچیں۔ کواڑ کی اوٹ سے دریافت کیا "کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ ہیں؟"

"ہاں! میں ہی ہوں۔"

"آپ کے نام سمن ہے، یہ لیجیے اور اس کاغذات پر دستخط کر دیجیے۔"

پری بانو نے خاموشی سے لفافہ لیا اور ہرکارے کے کاغذ پر رسید کے دستخط کر دیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کچہری سے مقدمات کے سلسلے میں نوٹس وغیرہ آتے ہی رہتے تھے، یہ سب بکھیڑے منیم جی کی جان کا روگ تھے۔ وہ ان سب جھمیلوں سے الگ ہی رہتی تھیں —— حسب سابق وہ آج بھی منیم جی کی آمد کا انتظار کرنے لگیں۔

اور جب منیم جی آئے پری بانو نے دالان میں رہ کر کواڑ کی اوٹ سے کچہری کا نوٹس انھیں دیا تو وہ اپنا سر پکڑ کر ایسے بیٹھ گئے، جیسے کسی عزیز کی موت کا تار پڑھ لیا ہو۔

پری بانو نے گھبرا کر پوچھا "خیر تو ہے کیا ہوا؟"

منیم جی سر جھکائے بیٹھے رہے۔

اب پری بانو کو بھی وحشت ہوئی "میں پوچھتی ہوں کیا بات ہے؟ آخر اس نوٹس میں ایسا کیا لکھا ہے جسے پڑھ کر آپ کے منہ کو چپ لگ گئی، کیا کسی نئی نیلامی کی خبر ہے... تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ہونا ہی ہے۔ بلا سے کل کی ہوتی آج ہو جائے تو اس عذاب سے جان تو چھوٹے۔"

"بیگم صاحبہ! اس مرتبہ عزت پر بن آئی ہے، جانیے عزت کی نیلامی کا نوٹس آیا ہے۔" منیم جی بہت گمبھیر آواز میں بولے۔

"کیا اول جلول کہے جا رہے ہیں، صاف صاف بولیے۔ ایسا ہم نے کیا کام کیا ہے جو ہماری عزت پر بن آئی ہے۔"

"میرا منہ نہیں کھلتا کیسے کہوں۔ کسی کمبخت حریص نے آپ کو پری محل سے بے دخل کرنے

کی اسکیم بنائی ہے۔ وہ خود کو سرکار کا اکلوتا بیٹا ظاہر کر رہا ہے جو تمنا بائی کانپور والی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ اس نوٹس کی رو سے نواب صولت مرزا نے تمنا بائی سے نکاح کیا تھا۔ ایک لڑکا سلطان خاں پیدا ہوا، جو اب بالغ ہو چکا ہے۔ اسی کی جانب سے تمام متعلقہ کاغذات عدالت میں پیش ہوئے ہیں۔ عدالت نے اس کی ولدیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ حویلی پری محل پر اس کی ملکیت کو تسلیم کرنے سے قبل ہمیں صفائی کے لیے ایک ماہ کا نوٹس دیا ہے۔"

یہ سب سنتے ہی پری بانو بڑے جذباتی انداز میں تڑپ کر بولیں "غلط.. بالکل غلط۔ نواب صاحب کا کوئی بیٹا نہیں ہو سکتا، یہ سراسر الزام ہے۔"

"ہاں ہاں بیگم صاحبہ میں بھی سمجھتا ہوں۔ یہ الزام ہے۔ دعویدار جھوٹا اور مکار ہے۔ مجھ سے زیادہ سرکار کے چال چلن کو اور کون جانتا تھا۔ ہمارے تمام مزارع ان کی نیک نفسی اور شرافت کی بنا پر ان کے نام کی قسمیں کھاتے تھے۔ میں ہزاروں گواہ عدالت کے سامنے پیش کر دوں گا۔ سرکار کسی غیر عورت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ چہ جائیکہ وہ کسی طوائف کے یہاں پھیرا ڈالیں۔ تمام مقدمہ جعلسازی پر مبنی ہے۔" منیم جی جوشیلے انداز میں بولتے چلے گئے۔ پھر وہ قدرے سست ہو کر بولے "پتہ نہیں کمبخت نے کس بودگی پر یہ کیس بنایا ہے۔ کافی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، پھر بھی آپ چنتا نہ کریں۔ میں اپنی جی جان ایک کر دوں گا اور سرکار پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔" یہ کہہ منیم جی تو چلے گئے لیکن پری بانو یادوں کے نرغے میں پھنس کر رہ گئیں۔ وہ اگر اپنی زبان کھولیں تو اس مقدمے کا تیا پانچہ ہو جائے اور یہ خاندان بد چلنی کے الزام سے بچ جائے لیکن... لیکن اس سے بھی بڑی رسوائی سامنے آ جائے گی۔ نہیں نہیں... پھر اس وعدے کا کیا ہوگا جو انھوں نے اپنے شوہر کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے ان سے کیا تھا اور اس کی پاداش میں وہ زندگی بھر انگاروں پر لوٹتی رہیں، جلتی جھلستی رہیں، لیکن زبان سے اُف تک نہ کی۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔ نہیں... نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا کہ مُردے کی قبر کی خاک اُڑائی جائے، جگ ہنسائی ہو... تو پھر میں کیا کروں.... الٰہی تو ہی مدد فرما۔" وہ سوچتے سوچتے نڈھال ہو گئیں۔ اور پُرانی یادوں کے گرداب میں ڈوبتی چلی گئیں۔

ان کے ابا جی جہانگیر خاں صولت مرزا کے والد کے تعلقہ کی خبر گیری پر مامور تھے۔ صولت مرزا کے والد نواب شجاعت مرزا اپنے تعلقے کا چکر لگاتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے۔ شجاعت مرزا نہایت خلیق اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ انھیں یاد ہے ان کے اپنے ابا جی جہانگیر خاں کہا کرتے تھے کہ بیٹا پری بانو تمھارا نام شجاعت مرزا کی ہی دین ہے۔ ورنہ میں نے تو تمھارا نام خاتون بانو رکھا تھا۔ لیکن جب شجاعت مرزا نے ننھی سی خوبصورت گڑیا کو دیکھا تو بے اختیار بولے ”بھئی جہانگیر یہ کیا بد ذوقی ہے۔ تم نے اس کا نام خاتون بانو رکھا ہے۔ یہ تو ماشاءاللہ بڑی ہو کر پری ہوگی پری، اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی۔ بس فوراً ہی حکم کی بجاآوری کے لیے تمھارا نام خاتون سے بدل کر پری بانو رکھ دیا گیا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ پری بانو نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔ شجاعت مرزا کا کہا صحیح ثابت ہوا۔ پری بانو کے حسن سے چاند بھی شرمانے لگا۔ انھیں دنوں ایک حادثہ ہو گیا پری بانو کے ابا جہانگیر خاں گھوڑے سے گر کر اپنے کولہے کی ہڈی توڑ بیٹھے۔ بوڑھے آدمی مہینوں پٹیاں بندھتی رہیں لیکن ٹھیک نہ ہو سکے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے اور چارپائی پکڑلی۔ اب وہ اپنی چاند سی بیٹی کی فکر میں گھلنے لگے کہ وہ تو اپاہج ہو چکے ہیں۔ بھلا ایک اپاہج کے گھر اچھا رشتہ کیوں کر آئے گا؟

ان ہی دنوں ان کے گھر نواب شجاعت مرزا تشریف لائے تو ان کے ہمراہ صولت مرزا بھی تھے۔ ابھی صولت مرزا جہانگیر خاں کی عیادت کر ہی رہے تھے کہ پری بانو دالان میں داخل ہوئیں اور انھوں نے حسب عادت شجاعت مرزا کی جانب خمیدہ ہو کر تسلیم کیا تو صولت مرزا بھی باتوں کے انہماک سے چونکے اور نظر اٹھا کر پری بانو کو دیکھا تو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

اس سے قبل کہ وہ اپنی پلکیں جھپکائیں پری بانو نے ان کی وارفتگی کو محسوس کر لیا۔ صولت مرزا کی نظروں سے رغبت و شوق کی آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ یوں شیفتگی سے اپنی جانب تکتے دیکھ کر پری بانو کے دودھ جیسے چہرے پہ حیا کا ارغوانی رنگ پھیل گیا جیسے برسات میں شام ہوتے آسمان پر سفید سفید بادلوں میں شفق کی سرخی گھل جائے۔

بے اختیار ہائے اللہ کہہ کر انھوں نے اپنے چہرے کو آنچل سے ڈھانپا اور ایک ہی

زقند میں دالان سے باہر چلی گئیں۔

شجاعت مرزا نے مسکرا کر جہانگیر خاں کی جانب دیکھا تو جہانگیر خاں ذرا خفیف سے ہو کر بولے "بچی ہے پہچان نہ سکی"۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک ہفتے بعد مشاطہ نے آکر خوشخبری سنائی کہ شجاعت مرزا پری بانو کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔ اگر جہانگیر خاں صولت مرزا کو اپنی فرزندگی میں لے لیں تو انھیں بہت خوشی ہوگی۔

جہانگیر خاں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ حامی بھری گئی اور کچھ ہی دنوں میں پری بانو ڈولے میں سوار ہو کر بڑی حویلی آگئیں۔

اور پھر وہ رات جس کے سپنے ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ وہ بھی آئی صولت مرزا حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ ان کے جسم اور کپڑوں سے نکلتی ہوئی عطریت پری بانو کے حواس پر چھا گئی انھوں نے چاہا کہ وہ آنکھ کھول کر اپنے مجازی خدا کو دیکھیں لیکن شرم دامن گیر ہوئی۔ ان کی آنکھیں کچھ اور ربچ گئیں۔ صولت مرزا نے کچھ شعر سنائے۔ ہمیشہ باوفا رہنے کا یقین دلایا، پیار کیا تو مدھم مدھم جذبات کی موجوں پہ ہلکورے لیتی خمار کی کشتی آگے بڑھتی رہی۔ وقت گزرتا رہا، گزرتا ہی رہا اور بجائے اس کے کہ یہ ناؤ ہیجان کے تیز دھارے میں جاکر طوفان کی نذر ہوجائے مایوسی کے پُل پر چڑھ کر ریت میں دھنس گئی۔ ملاح کے ہاتھ سے پتوار چھوٹ گئے۔ اور وہ خفت و ندامت کے غار میں گرا اس چمکتے ہوئے چاند کو حسرت سے دیکھنے لگا جو اس کی پہنچ سے دور نظر آرہا تھا۔

طوفان کی متوقع پری بانو نے سکوت سے اکتا کر اپنی آنکھیں کھولیں تو سامنے رنج و الم کی تصویر نظر آئی۔ جوشِ محبت نے گھبرا کر دریافت کرنا چاہا۔ خیر تو ہے دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی حیا نے دامن پکڑا تو جھپاک سے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سوتی بن گئیں۔ پھر وہ سچ مچ سوگئیں کیوں کہ کئی راتوں کے رتجگوں سے نڈھال بھی تھیں۔

صبح ہوئی، گلاب و کیوڑے کے پانی سے انھیں غسل کرایا گیا۔ طبع آزمائی کے لیے پھر رات آئی۔ پھر وہی بے چارگی، تیسری شب، چوتھی شب، آخر...

آخر صولت مرزا نے پری بانو کے پاؤں پکڑ لیے۔ روتے ہوئے بولے "بیگم مجھے معاف کردو، میں تمھیں خوشی نہیں دے سکتا۔"

"ہائے اللہ! یہ کیا کررہے ہیں؟" پری بانو نے پیر کھینچ لیے۔ یہ کمسن و معصوم سمجھ ہی نہیں سکیں صولت مرزا کس بات کا رونا رو رہے ہیں۔

پھر دھیرے دھیرے جذبات کی نا آسودگی نے انھیں سب کچھ سمجھا دیا۔

تو صولت مرزا نے بھی انھیں سمجھایا کہ میں اپنا علاج کراؤں گا ورنہ اپنی جان دے دوں گا پری بانو نے شوہر کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اُف اللہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں، مریں آپ کے دشمن۔"

"تو پھر آپ بھی ہم سے وعدہ کیجیے میری اس کمزوری کا تذکرہ آپ کسی سے نہیں کریں گی، ورنہ میں رُسوائی برداشت نہیں کرسکوں گا اور اپنی جان دے دوں گا۔"

پری بانو نے وعدہ کرلیا۔

اور ایک مدّت تک وہ جذبات کے الاؤ میں جلتی رہیں۔

جب رِم جھِم برسائتیں برستیں تو ان کے بدن کی اینٹھن بڑھ جاتی۔ وہ صحن میں نکل آتیں۔ بجلی کی خوفناک تڑپ اور بادلوں کی مہیب گرج بھی انھیں باز نہ رکھ پاتی۔ وہ اپنے تپتے بدن کو شرابور کرتی رہتیں۔ اسی طرح ایک بار کنوار کے مہینے میں جب بارش سے بھیگی یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں تو ان کا دل مچلا اور وہ آنگن میں آکر بارش میں بھیگنے لگیں۔ کنیزوں نے حیرت سے دیکھا، سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے من کو نہ سمجھا سکیں بھیگتی رہیں، خوب بھیگیں، پھر رات کو لرزے کے ساتھ جو بخار چڑھا تو صولت مرزا بھی گھبرا گئے ڈاکٹر حکیموں کا تانتا لگ گیا۔ ایک کے بعد ایک کی تجویز و تشخیص چلتی رہی لیکن بخار کو اُترنا تھا نہ اُترا۔ پورے سات دن لگ گئے۔ سات دن بعد بخار اُترا۔

اس عرصے میں صولت مرزا نے پری بانو کے پلنگ کی پٹی نہیں چھوڑی۔ وہ دن تو دن

راتوں کو بھی جاگ جاگ کر بری بانو کی تیمارداری کرتے رہے۔ صولت مرزا کی بے چارگی اور بے پناہ پیار اس آگ کو گلزار تو نہ بنا سکا، لیکن ایفائے وعدہ پر قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔

اور جب بری بانو اس بھٹی میں تپ کر کندن بن گئیں تو بے چارے صولت مرزا خود نہ رہے۔ وہ کسی نیم حکیم کا دیا ہوا پارے کا کشتہ کھا کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔ ان کی موت کی وجہ کو بری بانو کے تحمل نے سب سے پوشیدہ رکھا۔ موت کا سبب دل کا دورہ قرار دے دیا گیا۔

اب جب کہ تمام زندگی صبر کیا ہے اس وقت زبان کھولنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ بری بانو سوچتی رہیں اور رات گزرتی رہی۔

تین دن بعد منیم جی آئے تو بتلایا ہمارے وکیل نے نوٹس کا جواب دے دیا ہے۔ میں سرکار کی نیک چلنی کے ثبوت کے لیے گواہ تلاش کر رہا ہوں لیکن شاید صرف شہادتوں سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس حرافہ کے نکاح نامے کو جعلی ثابت کرنے کے لیے ہمیں کچھ اور ثبوت تلاش کرنا ہوگا۔"

مقدمہ چلا اور ایک دن منیم جی بہت اُداس اور منہ لٹکائے ہوئے واپس آئے۔ انھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں بتلایا "بیگم صاحبہ! ہم مقدمہ ہار گئے۔ مجھے اس حویلی کے ہاتھ سے نکل جانے کا اتنا غم نہیں ہے جتنا اس بات کا دکھ ہے کہ سرکار پر بدچلنی کا الزام آگیا ہے۔ پورے قصبے میں طرح طرح کی باتیں بن رہی ہیں۔ لوگ حیران رہ گئے ہیں کہ صولت مرزا جیسا شریف اور بدچلن ...؟"

"نہیں نہیں... وہ بدچلن نہیں تھے۔" بری بانو چیخ اُٹھیں "میرے پاس اس بات کا پکا ثبوت ہے۔ وہ بدکار ہو ہی نہیں سکتے۔ طوائف زادہ سلطان کسی اور کا نطفہ ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ! کیا آپ کے پاس واقعی کوئی ایسا ٹھوس ثبوت ہے؟" منیم جی کے تاریک چہرے پہ خوشی کی کرن یوں چمکی جیسے اندھیری رات کے مسافر کو بجلی چمک کر راہ دکھلا دے۔

"ہاں ہاں میرے پاس ثبوت ہے وہ بدچلن ہو ہی نہیں سکتے۔" پری بانو آپے سے باہر ہو کر دوبارہ چیخیں تو جذبات سے ان کا چہرہ تمتما اُٹھا اور تنفس تیز ہو گیا، بہت دیر تک زار و قطار آنسوؤں کے درمیان وہ سسکتی رہیں۔

اللہ میں کیا کروں، میں اپنی زبان کیسے کھولوں اس سے بہتر ہے تو مجھے موت دے دے اللہ تو مجھے موت دے دے۔ وہ فریاد کرتے کرتے چکرا کر گریں اور بیہوش ہو گئیں۔

پھوپھی اور خادمہ دوڑ کر آئیں، فرش سے اُٹھا کر بستر پر لٹایا۔ ہزار کوشش کے بعد بھی ہوش نہ آیا۔ پھوپھی جان نے منیم جی سے کہا۔ "ذرا دوڑ کر کسی ڈاکٹر کو تو بلائیے۔"

ڈاکٹر نے معائنہ کیا، سب ماجرا سُن کر مشورہ دیا "ابھی یہ سخت ہیجانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ میں نے دوائیں لکھ دی ہیں اور انجکشن لگا دیا ہے اب یہ کل صبح ہی سو کر اٹھیں گی۔ آپ لوگ ان سے مقدمے کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔ اگر ان کی کوئی قریبی سہیلی وغیرہ ہو تو وہ بات کرے۔"

دوسرے دن پری بانو کی خاص سہیلی آمنہ خاتون آگئیں۔ دن بھر تیمار داری کرتی رہیں، رات کو پری بانو کے ساتھ ہی سوئیں اور صبح کو جب انھوں نے بتلایا کہ صولت مرزا تو رجولیت سے محروم تھے، وہ زندگی بھر پری بانو سے اختلاط نہیں کر سکے تھے تو بھلا کسی طوائف سے کیا نکاح کیا ہو گا۔ کسی اولاد کی پیدائش کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔"

آمنہ خاتون کی بات سُن کر پھوپھی جان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ پھر ڈاکٹر صاحب آئے تو ان سے مشورہ کیا۔ تو ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور بولے "مجھے پہلے ہی کچھ شک ہو گیا تھا خیر اب شرم بے کار ہے۔ اس بات کو اپیل کر کے کورٹ تک لے جائیے۔ بھگوان نے چاہا تو فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے گا۔ لیکن کورٹ صرف بیگم صاحبہ کی گواہی تسلیم نہیں کرے گا آپ کو کسی سرکاری ڈاکٹر کی جانچ کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا ہو گا۔

پھوپھی جان نے اپنی گردن نفی میں ہلائی "ایسا ممکن نہیں ہے بانو مرتی مر جائے گی پر اپنی جانچ ہرگز نہ کرائے گی۔"

ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے "یہ ذمے داری میری ہے۔ مجھ پر چھوڑ دیجیے، آپ صرف اجازت دے دیجیے۔ میں خون وغیرہ کا ٹیسٹ تو کراؤں گا ہی اسی ٹیسٹنگ کے دوران لیڈی

ڈاکٹران کو نیند کا انجکشن دے کر جانچ کر دے گی۔ پری بانو کو خبر بھی نہ ہو سکے گی۔ ویسے بھی میں انھیں نیند کی دوائیں کھلا ہی رہا ہوں۔"

اسی طرح تمام مراحل خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ ڈاکٹری رپورٹ آگئی کہ پری بانو کا ازالہ بکارت ابھی تک نہیں ہوا ہے۔"

کورٹ نے سرٹیفکیٹ کو تسلیم کرتے ہوئے پری بانو کو ان کے بیان کے لیے طلب کیا۔

اب ایک مشکل یہ درپیش تھی کہ پری بانو کورٹ میں جا کر اپنا بیان دینے پر قطعی راضی نہیں تھیں۔ انھیں پھوپھی جان نے سمجھانے کی کوشش کی تو ان کی خشک آنکھوں سے آنسو جھر جھر گرنے لگے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولیں بس بُت بنی خاموش بیٹھی بہتے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے کے آنچل میں جذب کرتی رہیں۔

پھوپھی جان سے برداشت نہ ہو سکا۔ آگے بڑھ کر پری بانو کو گلے لگاتے ہوئے بولیں ـــ "قربان کروں میں ایسی حویلی بھاڑ میں جائے ایسی جھوٹی عزت۔ جان ہے تو جہان ہے۔ بیٹی تو ہلکان نہ ہو، جو مقدر میں لکھا ہوگا ہو جائے گا۔"

پھوپھی جان کے یہ سیدھے سادے محبت بھرے الفاظ اُلٹا اثر کر گئے جیسے کسی مریض کو دوا ری ایکشن کر جائے اور اس مریض کی حالت بجائے سُدھرنے کے مزید بگڑ جائے۔

بالکل اسی طرح پری بانو نے بھی پھوپھی جان کی بات سنتے ہی پہلے تو بلکنا شروع کیا پھر ان کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکلنے لگیں جو بتدریج تیز تیز ہوتے ہوتے فلک شگاف بن گئیں منہ سے کف جاری ہو گیا۔ وہ تیورا کر گریں اور بیہوش ہو گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کو فوراً خبر کی گئی۔ وہ آئے اور انھوں نے سکون کا انجکشن لگا دیا پھر انھوں نے بتلایا ان کے دل کی حالت بیحد نازک ہو گئی ہے۔ یہ بیحد ٹینشن میں مبتلا ہیں جب تک کہ یہ نارمل نہ ہو جائیں ان سے اس کیس کے سلسلے میں کوئی بات نہ کی جائے۔

پھر ایک دن پری بانو نے خود ہی دریافت کیا "آخر اس مقدمے کا کیا بنا آپ لوگ کوئی بات ہی نہیں کر رہے ہیں؟"

پھوپھی جان مسکرا کر بولیں "اللہ کے بھروسے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں یہ مناسب نہیں

سمجھتی کہ تم کورٹ کچہریوں میں بیان دیتی پھرو۔"

یہ سنتے ہی بری بانو کا مرجھایا ہوا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا جیسے کسی بچے کو ٹافیوں کا پورا ڈبہ مل گیا ہو۔ انھوں نے ممنون نگاہوں سے پھوپھی کی جانب دیکھا ہی تھا کہ درمیان میں بری بانو کی سہیلی آمنہ خاتون نے بات اچک لی۔ وہ فوراً ہی بولیں "مگر پھوپھی جان اس طرح دو گنی رسوائی ہو رہی ہے۔ کچھ حاسد کہہ رہے ہیں کہ آپ نے حویلی کو بچانے کی خاطر یہ چال چلی ہے۔ لہٰذا مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہونا بہت ضروری ہے۔ اب رہی بات اللہ بخشے دولہا بھائی کی کمزوری کی تو اس میں بندہ کیا کر سکتا ہے جہاں اور تمام بیماریاں ہوتی ہیں تپ بخار، ٹی بی، قولنج یا سرطان اسی طرح یہ بھی ایک بیماری ہے۔ سب خدا کی دین ہے۔" پھر اچانک آمنہ خاتون بری بانو کی جانب مخاطب ہوئیں اور بولیں "بانو تمھارا کیا خیال ہے؟"

اس اچانک حملے سے بری بانو گھبرا سی گئیں۔ انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور تھوک نگل کر رہ گئیں۔

بری بانو کی خاموشی کو تاڑتے ہوئے پھوپھی جان بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولیں "میں کہوں جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس گننے سے کیا فائدہ؟ خاک ڈالو سب پر جو قسمت میں لکھا ہوگا بھگت لیا جائے گا بس دعا کرو اللہ میری بچی کو صحت دے دے۔"

اب بری بانو سے برداشت نہ ہو سکا۔ انھوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر وحشت زدہ انداز میں پھوپھی کی جانب دیکھا پھر روہانسی ہو کر دھیمی آواز میں بولیں اور رسوائی کا کیا ہوگا؟

"وہ تو برداشت کرنا ہی ہوگی" پھوپھی نے بھی آنکھیں نکال کر اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔

"نہیں ... یہ نہیں ہو سکتا، مجھے کورٹ جانا چاہیے۔ میں کورٹ جاؤں گی ... میں جاؤں گی" وہ سسکنے لگیں۔

پھوپھی جان نے آگے بڑھ کر دلاسہ دیتے ہوئے بری بانو کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

بری بانو نے کورٹ میں جانے کا وعدہ تو کر لیا لیکن جیسے جیسے پیشی کی تاریخ نزدیک آتی جا رہی تھی ویسے ویسے ان کے چہرے کی زردی بڑھتی جا رہی تھی جیسے کسی پھانسی کے مجرم کو اپنے پھانسی پانے کے وقت کا علم ہو جائے۔

پھر کسی نہ کسی طرح یہ اذیت ناک دن تمام ہوئے اور وہ دن بھی آیا جب پری بانو کو کورٹ میں جا کر اپنا بیان دینا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد سے پھوپھی جان نے کئی تسبیحات پڑھ کر پری بانو پر دم کیا۔ امام ضامن باندھا۔ اختلاج قلب کے لیے قسم قسم کے خمیرے کھلائے اور بُرقع اوڑھ کر تینوں خواتین کا قافلہ منیم جی کی معیت میں کورٹ پہنچا۔

مقدمے سے متعلق تمام تمسکات پر نظر ڈالنے کے بعد حاکم نے پری بانو کو بیان دینے کا حکم دیا تو کسی نہ کسی طرح آمنہ خاتون پری بانو کو سہارا دے کر کٹہرے تک لائیں۔

حاکم نے پری بانو کو مخاطب کر کے کہا "حویلی پری محل پر سلطان خاں کی دعوے داری کے سلسلے میں عدالت کو یہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں کہ آپ کے شوہر صولت مرزا مرحوم لاولد تھے بلکہ وہ اس لائق ہی نہیں تھے کہ اولاد پیدا کر سکیں چوں کہ وطی کے قابل ہی نہیں تھے اس وجہ سے آپ بھی غیر مدخولہ رہی ہیں کیا یہ سچ ہے؟ اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

حاکم کے الفاظ سن کر پری بانو کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھا۔ ان کا سر بے اختیار نیچے جھکتا چلا گیا۔ انھوں نے حواس کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا لیکن آنکھوں پر قابو نہ رکھ سکیں۔ ان سے خاموش دھارے بہہ نکلے جیسے کسی ندی میں بے برسات کے باڑھ آجائے وہ عزت و ناموس کی ڈولتی نیا کے پتوار تھامے جذبات کی بپھری موجوں کو حالات کے سمندر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ حاکم نے جواب دینے پر اصرار کیا، تو پری بانو نے اپنے جسم میں اٹھتے ہوئے تشنج کی موجوں کے زیر اثر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور کٹہرے کی لکڑی کو ہاتھوں کے شکنجے میں لے کر پوری قوت سے کھینچا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ حاکم نے اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا "پری بانو جواب دیجیے آپ کے بیان کے بغیر اس مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔"

جواب میں پری بانو کی زبان تو نہ کھل سکی۔ البتہ جنگلے کی لکڑی پر سے ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ لڑھک کر نیچے آرہیں۔

پھوپھی جان چیختی ہوئی دوڑیں "ہائے میری بچی!"

لیکن ان کی بچی اب منجدھار سے نکل کر بہت دور جا چکی تھی۔

کھیل

ہوائی جہاز کے ہانگ کانگ پہنچنے کے اعلان کے ایک منٹ بعد ہی کمر کی بیلٹ کھول لینے کا اشارہ بلنک کرنے لگا۔ میں نے ٹک کھول کر بیلٹ ہٹائی اور جہاز کی طرف سے ملے ہوئے میگزین اپنے آگے کی سیٹ کے پاکٹ میں ٹھونس کر ایک لمبی سانس بھری۔ اچھی خاصی تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ کان الگ بند ہو کر سنسنا رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک دھچکا لگا اور جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ اونگھتے ہوئے مسافروں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے کسی سی۔ ڈی پلیئر پر اٹکی ہوئی فلم اچانک چالو ہو جائے۔

پھر جہاز کے رُکتے ہی کچھ مسافروں نے کھڑے ہو کر انگڑائیاں لینا شروع کر دیں تو کچھ جیل سے چھوٹے ہوئے قیدیوں کی طرح ایگزٹ کی جانب لپکے۔ میں نے بھی ایک لمبی انگڑائی لی اور اپنا سفری بیگ سنبھالتا ہوا جہاز سے باہر نکلنے والوں کی لائن میں شامل ہو کر ایئرپورٹ کی گیلری میں آگیا۔

اس سے قبل جب میں یہاں آیا تھا تو یہاں برٹش عملداری تھی اب جب کہ ہانگ کانگ چائنا میں شامل ہو گیا ہے۔ نئے ماحول کو دیکھنے کے لیے میں نے خاص طور پر دلچسپی لی اور گہری نظروں سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ وہی پرانا ایئرپورٹ تھا اور ویسا ہی با اخلاق امیگریشن اور کسٹم کا اسٹاف جیسا کہ برٹش کے عمل میں تھا۔

امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہونے کے بعد میں ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلا ٹیکسی ڈرائیور نے انگلش میں سوال کیا: ”کہاں جائیے گا؟“

اس کو جواب دینے سے قبل میرے ذہن میں جو چہرہ اُبھرا وہ مادام تی سی یونگ کا تھا۔

جو ہوٹل یونگ کی مالکہ ہیں۔ چائنیز لہجے میں انگریزی بولتی ہیں۔ بے شمار دلچسپ یادوں کی لہریں بھنور کی طرح میرے ذہن میں چکرانے لگیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے کھویا ہوا دیکھ کر سمجھا کہ میں کسی خاص ہوٹل کی بابت غور کر رہا ہوں تو اس نے کئی ہوٹلوں کے نام گنوا دیے۔ میں نے اس کی رہنمائی کا شکریہ اپنی مسکراہٹ سے ادا کرتے ہوئے کہا "مجھے چنگنگ مینشن پہنچا دو۔" ڈرائیور نے اثبات میں اپنی گردن کو جنبش دیتے ہوئے کسی قدر خم ہو کر" او کے" کہا اور ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

کچھ ہی دیر میں ٹیکسی اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔ کولون سائڈ میں چنگنگ مینشن ایک مشہور اور بڑی عمارت ہے۔ اس میں آمد و رفت کے لیے دو مین گیٹ ہیں ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی کئی گیلریاں ہیں اوپر نیچے کی آمد و رفت کے لیے چھ لفٹیں ہیں پھر اوپری منزلوں پر کئی موونگ اسٹیپس بھی نیچے اوپر کی منزلوں کا آپس میں تعلق رکھنے کے لیے رواں رہتی ہیں یہ ایک کاروباری سینٹر ہے۔ گراؤنڈ فلور پر دکانیں، شوروم اور کرنسی چینجر ہیں۔ اوپری منزلوں پر بھی دکانیں اور آفس وغیرہ ہیں، ہوٹل ہیں۔ کچھ لوگ اپنے فلیٹ کے سامنے کے حصے کو آفس اور پچھلے حصے کو رہائش کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ پوری بلڈنگ میں چائنیز، سکھ، سندھی اور پاکستانی و ہندوستانی مسلمان کاروبار کرتے ہیں۔ اسی رعایت سے یہاں اور اس کے گرد و نواح میں انگلش کے علاوہ اردو یا ہندی بولی جاتی ہے۔ یہاں برصغیر کے ملکوں ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیش سے لے کر افریقہ خاص طور پر نائجیریا کے لوگ خریداری کے لیے آتے ہیں۔ کھلونے، گارمینٹس، کاسمیٹک، جوتے، الیکٹرانکس کا سامان غرضیکہ انسانی ضروریات کی ہر چیز دستیاب ہے۔

میں جب چنگنگ مینشن پہنچا تو وہاں حسب روایات پوری رونق اور گہما گہمی تھی۔ میں نے اپنا سفری بیگ لیا اور لفٹ کے ذریعہ ساتویں منزل پر پہنچ گیا۔ سامنے ہی یونگ گیسٹ ہاؤس اینڈ ہوٹل کا سائن بورڈ تھا۔ دروازے کو پش کرتا ہوا میں اندر داخل ہو گیا۔

ہوٹل کے اندر داخل ہو کر مجھے بہت حیرت ہوئی یہاں اب وہ رونق نہیں رہی تھی۔ اس چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں آٹھ میزوں کی جگہ تھی جن میں صرف تین میزوں پر دو چار

آدمی بیٹھے ہوئے تھے بقیہ میزیں خالی تھیں۔ شام کے اوقات میں یہاں اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ لوگ زیادہ تر مشروب کاؤنٹر پر ہی کھڑے کھڑے پیا کرتے تھے۔ بھیڑ کی ایک وجہ بھی تھی حسن و رعنائی کے چلتے پھرتے نیم برہنہ مرقعے جو یہاں ٹیبلوں پر سرو کیا کرتے تھے اب وہ پُرانا ماحول یہاں نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے کاؤنٹر پر پہنچ کر کلرک کو بتلایا کہ میں مادام یونگ کا دوست ہوں۔ ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ علاوہ اس کے مجھے یہاں ایک کمرہ بھی چاہیے۔

میری بات سُن کر کلرک نے تعظیماً اپنی گردن خم کرتے ہوئے "اوکے" کہا اور نام وغیرہ کی خانہ پُری اور دستخط کے لیے رجسٹر میرے آگے بڑھا دیا۔ لیکن مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ یا نون ایئر کنڈیشنڈ چاہیے؟ دراصل ہانگ کانگ میں اس طرح کے سوال نہیں کیے جاتے میرے خیال سے یہاں جس طرح دکانوں اور مکانوں میں ایئر کنڈیشنڈ لگے ہوئے ہیں اس طرح ہمارے یہاں پنکھے بھی نہیں ہیں۔ مجھے تو کوئی چھوٹی موٹی دکان یا آفس ایسا نظر نہیں آیا جہاں ایئر کنڈیشنڈ نہ ہو۔

بیرے کو میرے کمرے کی چابی دیتے ہوئے کلرک نے مجھ سے کہا میں مادام کو آپ کے متعلق بتلادوں گا وہ جلد ہی آپ سے ملاقات کریں گی۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہوا تو مجھے چُنکنگ مینشن کے آزاد ہوٹل کا خیال آیا جس کے مالک آزاد کشمیر کے ہیں۔ ملائم اور گرم گرم کشمیری قُلچے اور بھُنی ہوئی بٹیریں۔ اس خیال کے آتے ہی میری اشتہا بڑھ گئی۔

ابھی میں باہر نکلنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے مادام تی سی یونگ کھڑی اپنی خالی خالی نظروں سے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ میں ان سے اپنے بارے میں کچھ کہوں ان کی چمکیلی آنکھیں روشن ہوگئیں اور زبردست تبسم کے ساتھ وہ چہک کر بولیں: "ہیلو مائی ڈیئر اٹ از یو؟" میں جواب میں مسکرا کر اپنی پوری بتیسی کھولنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک والہانہ انداز میں وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئیں اور اپنی پوری قوت سے مجھے بھینچتے ہوئے

انھوں نے اپنے ریشمی عارض میرے گالوں سے مس کیے۔ پرفیسی پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ کو معطر کر گئی لیکن ان کے جسم کی وہ پرانی مست بو معدوم تھی جو اُن کی قربت میں جاتے ہی حواس کو مشتعل کر دیتی تھی۔ پھر وہ مجھے خود سے جُدا کرتے ہوئے چائنیز لہجے والی انگلش میں شکایتی انداز لیے ہوئے کہنے لگیں "اتنے عرصے تک کہاں رہے؟ میں نے تو تمھیں بہت یاد کیا۔ پھر آہستہ آہستہ بھول گئی۔" یہ کہہ کر انھوں نے حسب عادت قہقہہ لگایا جس سے ان کے دونوں گالوں پر چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے۔

ان کی شکایت کے جواب میں مسکراتے ہوئے میں نے ان کے سراپے کا جائزہ لیا۔ مادام تی سی یونگ جن کو میں مادام تاؤ کہا کرتا تھا، حیرت انگیز طور پر ڈھل گئی تھیں۔ آج سے پندرہ سال قبل اُن کو دیکھ کر کسی ڈال کے پکے ہوئے قلمی آم کا احساس ہوتا تھا جس میں رس ہی رس بھرا ہو اور جو اپنے پورے تناؤ پر ہو دیکھنے میں سخت چھونے میں نرم و گداز، ان گنت پھولوں کی نشیلی مہک سے پُر، جو حواس کو بیگانہ بنا دے۔ سُرخی مائل گورے چہرے پر گول گول چمکیلی آنکھوں سے جب وہ مسکرائیں تو گھنیری پلکوں کے چھپّر جھک جاتے اور ان کے سیب جیسے سُرخ سُرخ گالوں میں گڑھے نمودار ہو جاتے۔ کس دل کی طاقت تھی جو ان کی اس ادائے دلبری کو دیکھ کر بے قابو نہ ہو جائے۔ وہ اپنے سخت مخروطی اُبھار کو ہمیشہ نیم عریاں رکھتی تھیں جس کے لیے بڑے گریبان کا بلاؤز نما شرٹ استعمال کرتیں۔ ان کے سفید مرمریں عُریاں بازو ہر دم اپنی جاذبیت کا اعلان کرتے رہتے۔ ناز کی ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے آنچ دیتے حُسن کا پیکر تھیں جس کی قربت سے حواس جھلس جاتے۔ ایک شریف النفس انسان بھی ان کو دیکھ کر ان کی رعنائی کے کمال میں کھو جاتا اور بار بار اس کی نظریں مادام کے جسمانی تناسب کی پیمائش کرنے پر مجبور ہو جاتیں۔ ان کے رسیلے ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک ترغیب آمیزی کا کام کرتی اور ان کا مدِ مقابل ان سے گفتگو کرتے وقت ہکلا جاتا۔

لیکن اب ان کا آنچ دیتا گدرایا ہوا بدن ٹھنڈا ہو کر گیلی مٹی کی طرح لجلجا ہو گیا تھا۔ اس شگفتہ بہار کو خزاں سمیٹ کر لے گئی تھی۔ وقت کا بے رحم دیو ان کی رعنائی کو نگل چکا تھا۔

شنگرفی گال پچک گئے تھے۔ ہونٹوں کے گلاب خشک ہو کر مُرجھا گئے تھے: بجلیاں برساتی
چمکیلی اور بے قرار آنکھیں مایوسی کے مدفن میں دفن تھیں۔ وہ سینے کا تناؤ جسم کا تناسب
سب پست ہو چکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بات بات پر مُسکراتا چہرہ آج پژمردہ
اور نڈھال نظر آرہا تھا۔

مادام کو دیکھ کر میرا دل کٹ گیا۔ جی میں آیا کہ میں ان سے دریافت کروں اتنی جلدی یہ
سب تبدیلی کیوں کر ہو گئی۔

اپنی حالت کا مجھے بغور مطالعہ کرتے دیکھ کر انھوں نے خود ہی مجھ سے کہا "یہ گھور گھور کر کیا
دیکھ رہے ہو؟"

میں نے مُسکرا کر جواب دیا "آپ کی حالت زار، یہ چاند اتنی جلدی کیسے گہنا گیا؟"
میرے اس سوال سے ان کی مایوسی اور کھوئی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک عود کر آئی۔
اور وہ مسکرا کر بولیں "چلو کوئی ہمدرد حال پوچھنے والا تو ملا" اس کے ساتھ ہی ایک
ٹھنڈی سانس بھر کر وہ خاموش ہو گئیں۔

میں نے محسوس کیا ان کے چہرے کی اُداسی کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی
باتیں کرنے کے بعد وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئیں کہنے لگیں "یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ میں
جا رہی ہوں رات کو پھر ملاقات کروں گی"۔

مجھے بہت حیرت ہوئی۔ بھلا مادام مجھے اتنی آسانی سے کہاں چھوڑتی تھیں وہ تو میری
صحبت کی رسیا تھیں۔ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گزارا کرتی تھیں لیکن اب
ان میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ ان کی خواہش کے مدِنظر میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور احترام میں
روم کے دروازے تک انھیں بائی کہنے کے لیے آیا۔

مادام کے جانے کے بعد میں بھی اپنا کمرہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا بھوک اب شدت
اختیار کر چکی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کام یاد آئے۔ ایسٹرن شپنگ کارپوریشن
میں جانا تھا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک شپنگ کمپنی ہے۔ اور بجائے کولون کے ہانگ کانگ
سائڈ میں واقع ہے۔ دراصل ملک ہانگ کانگ دو حصوں میں تقسیم ہے ایک جانب کولون ہے

اور دوسری طرف کا ہانگ کانگ کہلاتا ہے درمیان میں پانی یعنی سمندر ہے۔ دونوں حصوں کے رابطے کے لیے فیری اور میٹرو لائن ہے، میٹرو لائن یعنی زمین دوز ریلوے، جس کے کولون سے لے کر ہانگ کانگ سائڈ تک کچھ کچھ دور پر اسٹیشن بنے ہوئے ہیں ٹرین زمین کے اندر ہی اندر تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اور ایک بڑے ٹیوب میں سے گزرتی ہوئی سمندری حصے کو پار کر جاتی ہے۔ یوں ہم کولون سے ہانگ کانگ سائڈ میں جا پہنچتے ہیں۔

جب میں اپنا کام ختم کر کے واپس کولون آرہا تھا تو ایک پرانے شناسا پر میری نظر پڑی میری زبان سے بے ساختہ نکلا ارے کیلاش! یہ کہاں؟ میں جھپٹ کر آگے بڑھا اور اس کا راستہ روکتا ہوا اس سے مخاطب ہوا "کیلاش! ارے بھائی تم یہاں کہاں کب آئے؟" وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور گلے لگتا ہوا بولا "کب آیا یاد نہیں اب تو یہیں رہتا ہوں۔"

میں اور کیلاش کلکتے میں بھوانی پور کی ایک ہی بلڈنگ میں رہتے تھے چوں کہ دونوں کا تعلق یو پی کے ایک ہی شہر سے تھا اس وجہ سے اور بھی گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ کیلاش ایک شریف اور ہونہار نوجوان تھا۔ بوڈی بلڈر اور خوبصورت جو ہر قسم کی لغویات سے دور رہتا اسے تعلیم کا شوق تھا یا کسرت کے لیے جمنیزیم کلب میں جاتا تعلیم مکمل ہونے کے بعد باپ نے شادی کرا دی۔ کچھ دن وہ کلکتہ میں ملازمت تلاش کرتا رہا پھر کام کی تلاش میں ممبئی چلا گیا۔ آج تقریباً پانچ سال بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے فیری گھاٹ تک نکل آئے شام ہونے جا رہی تھی سمندر سے آنے والی ہواؤں کے جھکڑ بہت خوشگوار لگ رہے تھے۔ دن کی گرمی اور تپش دم توڑ چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات پھیل گئی۔ روشنیاں جگمگا اٹھیں اور بڑی بڑی عظیم الشان بلڈنگوں کی روشنیاں اور طرح طرح کے ڈیزائن بناتے جلتے بجھتے نیون سائن سمندر کے پانی میں اتر آئے۔ ہلکورے لیتے ہوئے پانی میں یہ روشنی کے عکس کٹھ پتلی کے ناچ کا تماشہ پیش کر رہے تھے۔ ان مناظر میں مجھے کھویا ہوا دیکھ کر کیلاش مسکرایا "ارے میں کیا کہہ رہا ہوں یہ کبھی تو سنیے جہاں انوکھا پن یا خوبصورتی آپ کو نظر آئی آپ اسی کے ہو لیے آج تک آپ کی یہ عادت نہیں گئی۔"

"بھئی سن رہا ہوں۔ یہ ہوائیں، یہ روشنیاں، یہ ماحول کیا کہہ رہا ہے۔ ان سب کی آوازیں تو سن لینے دو۔"

"روشنیوں کی آوازیں، ماحول کی آوازیں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" پھر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا "واقعی آپ کے ساتھ رہنے میں مزہ آتا ہے۔ آپ نے پرانے دور کی یاد دلا دی" پھر وہ افسردہ ہو کر بولا "پتہ نہیں گھر کا کیا حال ہے۔ ماں اور بابو اب بوڑھے ہو گئے ہوں گے میری پتنی رما بھی میرے انتظار میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوگی۔

"تم کب سے اپنے گھر نہیں گئے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے بات اڑا دی "چھوڑیے اس قصے کو چلیے اب چلیں۔ پھر فیری میں واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے وہ ریلنگ پکڑے زیادہ تر خاموش کھڑا رہا اس کی نظریں سمندر کے پانی پر مرکوز تھیں لیکن دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ شاید اسے اپنے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ میں نے بھی چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی مجھے فرصت ہی کہاں تھی۔ میں خود نیچر کی دلکشی میں کھویا ہوا تھا تیزی سے تیرتی ہوئی فیری کے انجن سے مرغولے بناتا سفید جھاگ دار پانی جب ہواؤں کے جھکڑ سے ٹکراتا تو اچھل کر ریلنگ تک آجاتا اور ہمیں کسی قدر بھگوتا جاتا یہ جھکڑ کبھی کبھی اتنے تیز ہو جاتے کہ وہاں کھڑے لوگوں کے قدم لڑکھڑا جاتے۔ آہستہ آہستہ کولون نزدیک آتا گیا۔ بڑی بڑی روشن بلڈنگوں کے عکس پانی میں ڈولنے لگے۔ پانی جب اچھلتا تو وہ عکس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتے پھر کچھ ہی دیر میں وہ ٹکڑے آپس میں پیوست ہو کر پانی کی سطح پر روشن عمارتوں کی شکل میں ڈولنے لگتے۔

کولون پہنچنے کے بعد کیلاش نے دریافت کیا "رات کا کھانا کہاں کھائیے گا؟ چلیے نائٹ مارکیٹ چلتے ہیں وہیں کھانا کھائیں گے۔"

میں نے نفی میں اپنی گردن ہلائی نا بابا نا یہ مینڈک کچھوے اور کیڑے مکوڑے میں ہضم نہیں کر سکوں گا۔ مجھے تو لوگوں کو یہ سب کھاتے دیکھ کر ہی قے آتی ہے۔"

"ارے نہیں یہ سب بلائیں کون کھاتا ہے۔ وہاں اب تبدیلی آگئی ہے۔ اچھے ریسٹورنٹ بھی ہیں۔"

"دراصل یہ نائٹ مارکیٹ خوانچہ فروشوں کی مارکیٹ ہے جو کولون سائڈ میں ذیلی سڑکوں پر رات کو لگتی ہے۔ رات ہوتے ہی یہاں عارضی دکانیں لگ جاتی ہیں۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز آپ کو یہاں سستے نرخوں پر مل جائے گی خاص طور پر الکٹریکل گڈس، گھڑیاں، کیمرے، مووی کیمرے، کھلونے، ٹی وی، سی ڈی سیٹ وغیرہ نئے نئے آئٹم جن کو ہانگ کانگ میں تلاش کرنے میں آپ کو خاصہ وقت لگے گا یہاں خوانچوں پر بکھرے ملیں گے۔"

جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے موبائل ریسٹورنٹ ہیں۔ مختلف قوموں کے عورت مرد بیٹھے الابلا کھاتے رہتے ہیں جن میں لمبے لمبے وارم، کیکڑے، سمندری مکوڑے اور کچھوے شامل ہیں کچھوا اُبال کر بیٹ چاک کر کے پلیٹ میں اُلٹا رکھ کر مسلم پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ چمچے سے کھرچ کھرچ کر پورا کچھوا چٹ کر جاتے ہیں۔

نائٹ مارکیٹ سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں ہوٹل چلے آئے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ دروازے پر کسی کی آمد کا اشارہ موصول ہوا۔ میں نے اندر آنے کی اجازت کا بٹن دبا دیا۔ تو آنے والی مادام تاؤ تھیں۔ ابھی وہ مُسکرا کر مجھے ہیلو کہہ رہی تھیں کہ ان کی نظر کیلاش پر پڑی۔

"ارے تم یہاں بیٹھے ہو مجھے فون تو کر دیتے میں کب سے تمھارا انتظار کر رہی تھی۔ تمھاری ہی خاطر مجھے دیر ہو گئی ورنہ میں کب کی یہاں پہنچ جاتی۔"

بجائے اس کے کہ کیلاش جواب دے میں مادام سے مخاطب ہوا "اچھا ہی ہوا کہ آپ تاخیر سے آئیں ورنہ ملاقات نہ ہوتی میں کیلاش کے ساتھ نائٹ مارکیٹ میں چلا گیا تھا۔"

"او ہو اب آپ کو اپنے ہم وطن جو مل گئے تو ہماری قدر کہاں ورنہ یہاں ہم سے اچھا ساتھی کہاں تھا؟ یہ کیلاش صاحب آپ کو کہاں مل گئے؟"

"دراصل یہ میرے پُرانے شناسا ہیں اور ہم ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہیں۔"

میں نے دیکھا کیلاش مادام کی آمد سے کچھ گھبرا سا گیا ہے۔ وہ اچانک اُٹھا اور مجھ سے مخاطب ہوا "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کل کسی وقت ملاقات ہوگی۔ اس سے قبل کہ میں اخلاقاً اس سے کچھ دیر اور رُکنے کو کہوں وہ بائی کہتا ہوا نکل گیا۔

اب وہی مادام تھیں۔ میں تھا اور تنہائی تھی۔ لیکن اب مادام کی باتوں میں چہکار کی جگہ غم و اندوہ کی پرچھائیاں تھیں۔ لہجے کی لرزش میں حسرت و یاس کے سائے لہرا رہے تھے۔

کیا اس وجہ سے کہ ان کا سینگ دیتا بدن سرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے ساغر اپنی شراب لٹا کر بے کشش ہو گئے تھے۔ ہونٹوں کے گلاب مُرجھا کر اپنی حقیقت کھو چکے تھے۔ نہیں شاید یہ بات نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ جوانی کے چراغ کا روغن ختم ہونے کے بعد بھی اس کی لو مدتوں تھرتھراتی رہتی ہے اور جب بجھتی ہے تب بھی ایک عرصہ تک چنگاری کی شکل میں سُلگتی رہتی ہے اگر کہیں سے ہوا ملے تو بھڑک بھی جاتی ہے۔ لیکن آج مادام کی آنکھوں میں مجھے کوئی دبی ہوئی چنگاری بھی نظر نہیں آئی چہ جائیکہ بات بات میں اشارے ملتے تھے۔

میں سوچتا رہا کہ جب میری پہلی بار اُن سے ملاقات ہوئی تھی میرا کسرتی بدن ان کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا میری دلچسپ باتوں اور لطیفہ گوئی سے متاثر ہو کر وہ میرے بہت نزدیک آ گئی تھیں پھر تو یہ ہوا وہ ہردم میرے ساتھ رہنے لگیں۔

ایک روز میری ان سے تمام دن ملاقات نہ ہو سکی۔ شام کو میں اپنے ایک ہندوستانی دوست کے ساتھ گولڈن نائٹ کلب چلا گیا۔ وہاں بہت بڑے بڑے شوکیسوں میں پانچ عدد حسن و رعنائی میں لاجواب نیم برہنہ حسیناؤں کے مجسمے ایستادہ تھے۔ میں نزدیک گیا تو حیرت ہوئی مجسمہ پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھے آنکھ ماری اور مسکرا کر اپنے سر کو خم کیا۔ میں نے بوکھلا کر مجسمے کو غور سے دیکھا کہ یہ کس میکینیزم سے چل رہا ہے۔ میرے استعجاب کو دیکھ کر میرے ساتھی نے شوکیس کے اوپری جانب اشارہ کیا جہاں "آئی ایم اونلی فور ریو" لکھا ہوا تھا —— میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا اور استفہامیہ نگاہوں سے اپنے ساتھی کو تکنے لگا۔ وہ مُسکرا کر بولے "لائیے ایک ہزار ہانگ کانگ ڈالر نکالیے اور کسی کو بھی اپنے ساتھ لے جائیے رات بھر عیش کیجیے لیکن ہاں آپ کو اسی کلب کا کمرہ بُک کرنا ہوگا آپ باہر نہیں لے جا سکتے۔

میرا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا "تو کیا... یہ... یہ؟"

وہ مُسکرا کر بولے "جی ہاں یہ بُتِ قامت پتھر کے صنم نہیں بلکہ سچ مچ کے بُتِ کافر ہیں۔ بزنس کا یہ بھی ایک انداز ہے۔" پھر انھوں نے میری چٹکی لی "کیا خیال ہے...؟"

"اب یہی خیال ہے آپ مجھے واپس چل کر کھانا کھلوادیں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر جب میں واپس ہوٹل آیا تو مادام میرا انتظار کر رہی تھیں۔ بڑی خفگی سے گویا ہوئیں۔

"آج کہاں رہے ملاقات ہی نہیں ہوئی؟"

میں نے نائٹ کلب کا واقعہ دہرایا تو انھوں نے بڑی ادا سے اپنا گوگل ناک پر سے نیچے کھسکایا اور مجھے شرارت بھری نظروں سے تکتے ہوئے بولیں "آئی سی، آپ کو ان سب چیزوں کا بھی شوق ہے؟"

میں نے جواب میں ایک ٹھنڈی سانس بھری "یہ سب ہمارے نصیب میں کہاں؟ بس ہر چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کو دل چاہتا ہے۔"

"اچھا تو کل آپ میرے ساتھ چلیے میں آپ کو ہانگ کانگ بھی گھماؤں گی اور رات کو اپنے کلرا سپاٹ کی سیر بھی کرادوں گی۔"

دوسرے دن میں کام سے فارغ ہو کر جلد واپس آگیا۔ مادام میرا انتظار کر رہی تھیں، سب سے پہلے ہم اُوشن پارک پہنچے۔ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ جگہ جگہ کراٹا کی جھاڑیاں کاٹ کر مختلف جانوروں کی شکل دے دی گئی۔ طرح طرح کے الکٹرانک جھولوں پر عورتوں اور بچوں کے غول چپٹے ہوئے تھے۔ آگے سمندر ہے۔ موجیں مارتا ہوا نیلگوں پانی، سنہری موٹے دانوں والی ریت۔ جس پر جگہ جگہ رنگین چھتریاں نصب تھیں، یورپین و چائنیز قوموں کے مرد عورت نیم برہنہ ان چھتریوں کے نیچے لانگ چیئر پر آرام کر رہے تھے۔ چھوٹے بچے ریت سے کھیل رہے تھے۔ بے شمار آدم و حوا کی اولادیں سمندر میں نہا رہی تھیں۔ کس کا ستر کھلا ہے اور کس کا آدھ کھلا اس سے بے نیاز سب اپنی اپنی دُھن میں مست تھے۔

مادام نے بھی ایک چھتری حاصل کی۔ کچھ کھانے کا سامان، کافی اور بیئر کے آرڈر بک کرائے اور مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کرتی ہوئی وہ کینٹین کی عمارت میں چلی گئیں۔ دس منٹ بعد جب وہ واپس آئیں تو میں نے بوکھلا کر انھیں دیکھا۔ مختصر سے سوئمنگ کاسٹیوم میں

کھڑی وہ میرے سامنے مسکرا رہی تھیں۔ بکنی کی مختصر پٹی ان کی بھری ہوئی چھاتیوں کے بوجھ کو یوں سنبھالے ہوئے تھی جیسے کوئی دھوبی اپنی گٹھری بجائے گدھے کے کسی بکری پر لاد دے۔

معلوم ہوتا تھا ان کے بدن کے کساؤ سے بکنی کے بندھ تڑخ کر ٹوٹ جائیں گے۔ میں نے پُرشوق نظروں سے انھیں دیکھا پھر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔ طبیعت نے پھر اُکسایا تو کن انکھیوں سے انھیں دوبارہ دیکھنے لگا۔ میری بے چینی کو دیکھ کر انھوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"کیوں کیا ہوا؟ کچھ بوکھلا سے گئے ہو؟" پھر میرے شانے پر انھوں نے اپنا ریشمی ہاتھ رکھا اور میرے بازوؤں کی مچھلیوں کو آہستگی سے دباتے ہوئے بولیں "تم اتنا بنتے کیوں ہو؟ جب ایسے ہی پارسا ہو تو کسرت کی مشقت کیوں اُٹھاتے ہو؟"

"محض ان عورتوں کے پندار کو توڑنے کے لیے جو خود کو نیم عریاں رکھ کر سمجھتی ہیں کہ ہر مرد ان کے پیچھے دُم ہلاتا پھرے گا۔"

انھوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا "تو گویا لوہے کو لوہے سے کاٹنا چاہتے ہو؟ گڈ، ویری گڈ۔"

کچھ اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم چھتری کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ مادام نے چپس کے پیکٹ اور بیئر کے ٹین کھول لیے۔ پھر کچھ دیر بعد ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سمندر میں اُتر گئے۔

سی بیچ پر ہم لگ بھگ شام تک رہے۔ "اب مزید کیا پروگرام ہے" میں نے مادام سے دریافت کیا تو وہ بولیں "چلو تمھیں اپنے کلراپاٹ کی سیر کرادوں پھر واپس گھر چلیں گے۔"

جب ہم کلراپاٹ پہنچے تو ایک قدآور مخلوط النسل چائینیز نے ہمارا استقبال کیا۔ معلوم ہوا مسٹر لیانگ چی یہاں کے منیجر ہیں۔ مضبوط جسم والا یہ انسان جس کی آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی مجھے پسند نہیں آیا۔ چہرے کی سفاکی اور آنکھوں کی چمک اس کے

اندر چھپی ہوئی خباثت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

جیسا کہ میں نے قیاس کیا تھا کلر اسپاٹ بھی ایک نائٹ کلب ہی ثابت ہوا۔ بالکل گولڈن نائٹ کلب کی طرح ایک بڑے ہال کے وسط میں اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر نیم برہنہ لڑکیاں اپنی آدھ کھلی چھاتیوں اور ننگے کولہوں کے ابھار کو میوزک کی دھن پر جھٹکے دے دے کر جنسی ہیجان کا اظہار کر رہی تھیں اور کبھی کبھی وہ ناچتے ناچتے اپنی انگلیوں کو جادوگرنیوں کے انداز میں اس طرح گردش دیتیں گویا وہ جوش جنون میں اپنے مدمقابل کا منہ نوچنے جا رہی ہوں۔ جلتی بجھتی رنگین اسپاٹ لائٹس ان کے ایٹریکشن کو مزید بڑھاوا دے رہی تھیں۔ کان پھاڑ دینے والی میوزک شور مچا رہی تھی۔ ایک غیر آسودہ، بے چین، اور مضطرب معاشرے کی عکاسی کا نظارہ تھا۔

میں نے کچھ دیر تماشہ دیکھا پھر مادام کے ہمراہ ان کے آفس میں چلا آیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انھوں نے انٹرکوم پر بات کر کے مسٹر لیانگ چی کو طلب کیا اور میری جانب اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔ "مسٹر چی! یہ میرے بہت ہی قریبی دوست ہیں انھیں اپنی ہیون کی سیر کرانا ہے۔ پروگرام تو شروع ہو گیا ہوگا؟"

"یس مادام" چی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تو پھر چلو"

مسٹر چی نے خاص چائنیز انداز میں قدرے جھک کر مجھے تعظیم دی اور ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے چلنے کو کہا۔

یہ ایک نیم تاریک بڑا سا ہال تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں مست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ نہایت مدھم سُروں میں ہلکورے لیتی ہوئی موسیقی در و دیوار سے پھوٹ رہی تھی ——— خوابناک سی تاریکی میں اگر کچھ روشن تھا تو وہ تقریباً دو درجن مہ وشوں کے حسین مومی مجسمے تھے جو کسی نہ کسی خاص ادا سے کھڑے ہوئے اپنی نمائش کر رہے تھے۔ چھت اور دیواروں سے نکلنے والی رنگین لائٹیں مختلف زاویوں سے آ کر ان مجسموں کو روشن کیے ہوئے تھیں ان سے ٹکرا کر پلٹتا ہوا روشنی کا مدھم سا انعکاس ہی ہال کو بھی کسی حد تک نیم روشن کیے ہوئے

تھا۔ روشنیاں پل پل اپنے رنگ بدل رہی تھیں۔ سرخ، بنفشی، پیلی تو کبھی نیلی، ہال کے وسط میں ایک بڑا گول اسٹیج نما دائرہ آہستگی سے گردش کر رہا تھا اسی اسٹیج پر یہ مجسمے ایستادہ تھے۔

ابھی میں منظر کے حسن میں کھویا ہوا ہی تھا کہ ہال میں ایک آواز گونجی نمبر ''۱'' الیون اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا ایک مجسّمے میں حرکت ہوئی۔ اس نے اپنے سر کو تعظیماً ہلکا سا خم کیا اور اسٹیج سے اُتر کر وہ ایک نیم روشن دروازے میں داخل ہو گیا۔

میں نے استفہامیہ نظروں سے مادام کی جانب دیکھا وہ مسکرا رہی تھیں۔

پھر انھوں نے سرگوشی کی ''سنو! کوئی بیوقوفی کی بات نہ کر بیٹھنا یہ اسٹیچو نہیں بلکہ زندہ ماڈل ہیں۔ نمبر الیون پسند کر لی گئی ہے لہٰذا وہ اپنے خریدار کے پاس چلی گئی۔

اتنے میں میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے اور تماشہ بین بھی نظر آئے جو خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا کاؤنٹر بھی تھا۔ لوگ اپنی پسند کا اظہار کرتے پیمنٹ کرتے اور اس ماڈل کا اعلان ہو جاتا۔

اب میری آتشِ شوق بھڑکی تو میں چند قدم آگے بڑھ کر ان ماڈلس کے نزدیک چلا گیا۔

ننگے بدن پر ستاروں والی جھالر زیرِ ناف لپیٹی ہوئی ٹاپ لیس حالت میں یعنی کھلی ہوئی چھاتیوں والی سڈول جسم کی پری صورت اور جوان رعنا مہ پاروں کا میلہ تھا۔ میری پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا اور میں دم بخود ہو کر اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے انھیں تکنے لگا۔

میرے حواس اس سارے منظر کی دلکشی کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے تھے۔

جب سُرخ سُرخ روشنی روشن ہوتی تو یہ بدن گلنار ہو جاتے اور ان سے شعلے لپکنے لگتے جو کسی بھی خرمنِ دل کو پھونکنے کے لیے کافی تھے۔ پھر نارنجی اور بنفشی رنگ بدلتے بدلتے ان کے جسم زردی مائل سفید دکھلائی دینے لگتے تو یہ اجسام بالکل مومی مجسمے معلوم ہوتے جیسے لندن میں مادام تساؤ کے مومی مجسمے اصل کے بالکل قریب۔ لیکن یہاں تو غضب کی بات تھی۔ اصل کو مجسّمے کی شکل میں ڈھال دیا گیا تھا۔ جو کچھ بھی میرے سامنے

تھا وہ خواب وخیال سے باہر تھا۔ اس جگہ کے لیے ہیون کا لفظ مادام نے غلط نہیں استعمال کیا تھا۔

میرا اس محویت میں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا کہ میں نے اپنے بازو پر ایک لطیف سا دباؤ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو مادام مسکرا رہی تھیں۔ "چلیے! کاؤنٹر پر چل کر اعلان کرا دیجیے کہ کس کو پسند کیا ہے؟"

"میری جیب میں پیسے نہیں ہیں" میرے منہ سے ایک گمبھیر طرز کی آواز نکلی جو شاید میری آواز تو نہیں تھی؛

"پیسے آپ سے کون کافر مانگتا ہے آپ تو مہمان ہیں۔ بس اپنی پسند بتلا دیں۔"

اتنے میں میں اپنے حواس میں آچکا تھا۔ شوخی سے انھیں دیکھتے ہوئے بولا "ہوس تو سب کا تقاضہ کر رہی ہے۔"

"اس کے لیے تو آپ کو ہانگ کانگ میں ڈیڑھ دو مہینے قیام کرنا ہوگا تب جاکر بات بنے گی۔"

"تو پھر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا...؟"

"آپ آئندہ مجھ سے نہ ملیں۔"

"کیوں...؟"

"بھلا آپ کے آگے ان کی کیا حقیقت ہے جس نے آپ کو نہ دیکھا ہو وہ ان کھلونوں سے دل بہلائے۔" میں نے مسکہ لگایا۔

جواب میں مادام نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا پھر اپنی چٹکی سے میری ناک دباتے ہوئے بولیں "یو... ناٹی بوائے۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں ہال سے باہر آگئے۔ آفس میں پہنچنے کے بعد مادام نے سوال کیا میرا کلیکشن آپ کو کیسا لگا؟"

"مجھ سے مت پوچھیے۔ زبان میں اتنا دم نہیں ہے کہ آپ کے کلیکشن کی تعریف کرسکے

حیرت ہے ان نوادر کو آپ نے کہاں سے ڈھونڈ نکالا۔ میرے خیال سے تو آپ دوسری مادام تاؤ ہیں۔"

"بھئی اس کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ چائنا، فلپائن، تھائی لینڈ اور برما کے سفر کرتی ہوں تب کہیں جاکر گوہر مراد حاصل ہوتا ہے۔"

"پھر بھی حیرت کی بات ہے یہ سب آپ کے اشاروں پر ناچتی کیوں کر ہیں؟"

"کچھ طریقے ہیں ان پر چل کر ان کو رام کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ لڑکیاں یہاں ہم سے بڑی بڑی رقومات لیتی ہیں جوا کھیلتی ہیں اور پھر جب ہمارا قرض نہیں ادا کر پاتیں تو ہم انھیں اپنے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔"

رات کو میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا ماضی کی یادوں میں دبی چنگاریاں کرید رہا تھا۔ مادام میرے لیے بہت دلچسپ شخصیت رہی ہیں۔ کبھی صرف دوست نظر آتی ہیں اور کبھی وہ محبوبیت کی حد تک بڑھ جاتی ہیں۔ پہلے جب میں انھیں مادام تاؤ کہتا تھا تو ان کے چہرے پہ فخر و ناز کی شوخی لہرانے لگتی تھی اور کل جب میں نے انھیں مادام تاؤ کے ٹائٹل سے پکارا تو بجائے غرور تمکنت کے ان کے چہرے پہ رنج والم کے سائے لہرانے لگے۔ ان کی آنکھوں میں شوخی کے کوندے لپکنے کے بجائے حسرت و یاس کی تاریکیاں امنڈ آئیں۔ "کیوں؟ آخر کیوں؟" ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ اندر آنے کی اجازت کے بعد کیلاش میرے سامنے کھڑا تھا۔

"آؤ... بھئی کیلاش آؤ! میں تمھیں یاد کر رہا تھا۔"

جواب میں وہ سنجیدگی سے بولا "مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

"پہلے آرام سے بیٹھ تو جاؤ ایسی بھی کیا بات ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے میں شادی کرنے کے بعد ممبئی چلا گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک پارٹی سے ہوئی جو مجھے یہاں ہانگ کانگ لے آئی۔ میں یہاں سے الیکٹرونک گڈس ہندوستان لے جانے لگا۔ کام اچھا چل رہا تھا کہ ایک مرتبہ مادام کے ہوٹل میں آکر ٹھہرا ان دنوں کلرا پاٹ پر پولیس کا ریڈ ہوا تھا۔ مادام کا منیجر اور پارٹنر لیانگ چی گرفتار

تھا۔ اس کا کسی لڑکی سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ جی نے غصہ میں لڑکی کی جان لے لی۔ جی پر مقدمہ چلا اور اُسے سزا ہوگئی۔ گو کہ کلر اسپاٹ کا لائسنس تھا مگر کچھ لڑکیوں کے مخالف بیانات کے بعد وہ بند کر دیا گیا۔ اور ویسے بھی کلر اسپاٹ جی کی دھونس پر ہی چلتا تھا۔ مادام کی نظر مجھ پر پڑی تو انھوں نے مجھ سے دوستی کر لی۔ پھر وہ ہر دم مجھے اپنے ساتھ رکھنے لگیں۔ دراصل وہ مسٹر جی کے جیل چلے جانے کے بعد سے بہت تنہا ہوگئی تھیں۔

جی ان کا مینیجر ہی نہیں تھا بلکہ ان کی نجی زندگی کا بھی پارٹنر تھا۔ وہ اپنی جنسی خواہشات اسی سے پوری کرتی تھیں۔ اس بات کا اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہوگا کہ باڈی بلڈر قسم کے مردوں پر مادام کی رال ٹپکتی تھی۔ اتفاق سے میں بھی باڈی بلڈر تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگیں "کیلاش تم مضبوط تو ضرور ہو پر وحشی نہیں ہو کاش تم گنوار اور وحشی ہوتے۔"

"میں اگر وحشی ہوتا تو کسی قید خانے میں اپنی زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہوتا۔"

میرے جواب سے وہ افسردہ ہوگئیں۔

میں جب بھی ہندوستان جانے کا ارادہ ظاہر کرتا تو وہ ایک معقول رقم میرے ہاتھ پر رکھ کر مجھے روک لیتیں۔ پھر میرے اور ان کے درمیان ایک طرح کا ایگری منٹ ہوگیا۔ اب ہر ماہ میرے گھر والوں کو پچیس ہزار روپے مل جاتے ہیں جس کا انتظام مادام کرتی ہیں۔ علاوہ اس کے مجھے یہاں عیش کے ساتھ جیب خرچ بھی ملتا ہے۔

"تو گویا تم رکھیل ہو؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اب آپ جیسا سمجھ لیجیے" وہ اداس لہجے میں بولا۔ پھر کچھ آگے جھک کر بڑے گمبھیر لہجے میں کہنے لگا "مجھے آپ سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

جواب میں میں نے ہمہ تن گوش ہوکر اپنی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پہ مرکوز کر دیں۔

"بات یہ ہے آپ میرے گھر والوں کو سمجھا دیجیے گا کہ وہ میری بھیجی ہوئی رقم سے کوئی فلیٹ خرید لیں یا پھر میرے لڑکے کے نام سے وہ رقم بینک میں جمع کراتے رہیں تاکہ اس کا فیوچر بن جائے اور انھیں سمجھا دیجیے گا کہ میں ابھی گھر نہیں جا سکوں گا وہ میرے گھر جانے کے بارے میں ضد نہ کریں۔"

"کیوں ایسی کیا قباحت ہے؟" میں نے سوال کیا "اب مادام کی جوانی کا چراغ تو بجھ ہی چکا ہے۔ مہینے دو مہینے کے لیے جانے میں کیا حرج ہے؟"

"مادام تو اجازت دے ہی دیں گی مگر وہاں میری پتنی جو ہے!"

"پتنی جو ہے؟ میں نہیں سمجھا... پتنی میں ایسی کیا بات ہے جو تم اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔"

میرے اس سوال سے کیلاش کے چہرے پہ کشمکش کی الجھن پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے غم و اندوہ کی کالی گھٹائیں اس کے چہرے پہ چھا گئیں۔ حسرت و یاس کا بے بس سمندر اس کی آنکھوں میں موجیں مارنے لگا۔ کچھ لمحے وہ ضبط کرتا رہا۔ پھر برداشت وتحمل کے بندھ سے دل میں اٹھتا ہوا طوفان ٹکرایا تو اس میں رخنے پڑ گئے جس کی درزوں میں سے سیلاب کے چند قطرے نکل کر اس کے گالوں پر رینگنے لگے اور وہ سسکتا ہوا بولا "میں مجبور ہوں بہت مجبور... میں اپنی بیوی کے پاس نہیں جا سکتا کیوں کہ مجھے ایچ آئی وی انفیکشن زبردست ہو گیا ہے اور میں ایڈز کے دہانے پر کھڑا ہوں۔"

"ایڈز...؟" میں اچھل پڑا۔ جیسے بستر میں اسپرنگ نکل آئے ہوں۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ گویا تمھیں مادام نے تباہ کر دیا۔"

"نہ... نہ اُن کو کچھ نہ کہیے وہ بے چاری سمجھ ہی نہیں پائیں۔ پہلا میرا ٹیسٹ ہوا تھا۔ جب میرا انفیکشن سامنے آیا تو گھبرا کر انھوں نے بھی ٹیسٹ کرایا۔ ان کا رزلٹ بھی میرا جیسا ہی رہا۔ دونوں کا علاج جاری ہے اور تمام خرچ مادام ہی برداشت کر رہی ہیں۔ ایک تو مہنگا علاج ہے اور پھر میں اپنی پتنی کو کیا یہ سب بتلا سکوں گا۔ بھگوان سے پرارتھنا کیجیے شاید میں واپس جا سکوں۔"

"کیا مسٹر جی کو بھی یہ بیماری تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں، ہرگز نہیں! جی محتاط آدمی تھا، دراصل جی کے جیل جانے کے بعد مادام غیر آسودہ رہنے لگی تھیں۔ انھیں دنوں ان کی ملاقات ایک امریکن ٹولے سے ہو گئی جس میں ایک لمبا تڑنگا دیو پیکر بھی تھا بس عیش و نشاط کے دروازے کھل گئے۔ کچھ دن موج مستی رہی۔ پھر امریکن چلے گئے۔

اب پتہ نہیں یہ وبال کس دروازے سے داخل ہوا ہے۔"

"کیلاش تو اپنے دامن کے انگارے میری گود میں ڈال کر چلا گیا لیکن وہ مجھے احساس کی سُلگتی کھائی میں دھکیل گیا ہے اور اب میں سوچ کی دوزخ میں جل رہا ہوں۔ کل رات میری فلائٹ ہے۔ وطن واپس جا کر میں کیلاش کے باپو کو اس کے بارے میں کیا بتلاؤں گا۔ کیا یہی کہ آپ کو کچھ دن تک رقم اور ملتی رہے گی لیکن اب آپ اپنے بیٹے کا چہرہ نہ دیکھ سکیں گے؟ شاید... شاید

جیون ایک الاؤ

چمپا نے دالان میں کھڑے ہوکر آسمان کی جانب نگاہ اُٹھائی۔ سامنے چھت کی مُنڈیر پر پیلی پیلی دھوپ سردی سے لرز رہی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی شام ہونے جارہی ہے جلدی کرنا چاہیے۔ اس نے لپک جھپک چوکے کا کام ختم کیا اور ہاتھ منہ دھوکر بال سنوارنے بیٹھ گئی۔ آج بہت دیر ہوگئی تھی کہیں رامو نہ آجائے وہ رامو کے آنے سے قبل ہی اپنے کونک سُک سے درست کرلیتی تھی۔

آج بھی اس نے بال سنوار کر تھوڑی سی اسنو چہرے پہ لگائی اور کاجل کی سلائی آنکھوں میں پھیرنے کے بعد ایک لال رنگ کی بندیا ماتھے پر چپکائی اور جوہی کے پھولوں کی مالا جو اس نے کچھ دیر قبل ہی بڑے چاؤ سے پرو کر رکھی تھی بھیگے ہوئے کپڑے میں سے نکال کر جوڑے میں لگالی پھر آئینے کے سامنے جاکر اس نے اپنے سراپے کو دیکھا اور مُسکراتی ہوئی دروازے پہ جاکر رامو کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔

کچھ ہی دیر میں گلی میں سناٹا چھا گیا۔ جھٹ پٹے کا ملگجا اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ کر تاریکی میں تبدیل ہوتا جارہا تھا اور بیچ میں کھڑا ہوا املی کا درخت آہستہ آہستہ گھیرے میں مدغم ہوتا جارہا تھا۔ درخت پر بیٹھے ہوئے گِدھ کبھی کبھار اُڑ کر اپنی جگہ تبدیل کرتے تو پھڑپھڑاہٹ کی آوازیں فضا میں بے ہنگم سا شور پیدا کردیتیں اور پھر وہی سناٹا چھا جاتا۔ دور گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کا بلب جل رہا تھا اس بلب کی مدھم سی روشنی گلی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس ہلکے ہلکے اُجالے میں چمپا کسی راہ گیر کا جھانولا دیکھتی تو اُسے آس بندھتی کہ شاید یہی رامو ہو وہ سائے پر اپنی نظریں جمادیتی۔ آنے والے

سے زیادہ تیز اس کا سایہ چمپا کی جانب لپکتا۔ چمپا سائے کو پہچاننے کی کوشش کرتی۔ سایہ لمبا اور لمبا ہوتا جاتا۔ پھر اُمید کی دھنک مایوسی کی تاریکی میں تبدیل ہو جاتی۔ جیسے کسی چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا مسافر اپنی ٹرین کا انتظار کر رہا ہو، رات کی تاریکی میں دور سے گاڑی کی بتی کی چمک آس کی کرنوں کو جگمگا دے اور یہ ریل گاڑی بغیر رُکے دھڑ دھڑاتی ہوئی پلیٹ فارم سے گزر جائے بالکل اسی طرح آس بندھتی اور ٹوٹتی رہی اسی آنکھ مچولی میں وقت گزرتا گیا اور ماحول پر مکمل سکوت چھا گیا۔

اب صرف کتوں کا ایک جوڑا آپس میں مستیاں کرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کبھی ایک دوسرے کا منہ نوچتے تو کبھی کوئی اپنے مخالف کو پنجہ مارتا تو کبھی وہ دھیرے سے غراتے ہوئے ایک دوسرے پہ لیٹ پڑتے۔ ایک گر جاتا اور چیت ہو کر اپنے پنجے دوسرے کے منہ پر مارتا تو وہ بھاگتا پھر دوسرا اُٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور دوڑ کر دوسرے کو دبوچ لیتا اور پھر وہی اٹکھیلیاں جاری ہو جاتیں۔

نہ جانے کیوں چمپا کو ان کی یہ مستیاں بہت بھاتیں اور وہ اس جوڑے کی آنکھ مچولی میں ایسا کھوئی کہ یہ بھی بھول گئی کہ رامو کا انتظار کرتے کرتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔ وہ تو اس وقت چونکی جب اُس کے کان میں آواز آئی۔

"بھوجی کا رامو کا انتجار کرت ہو۔ وہ تو بھٹی کے تھلے پر پیئے پڑا ہے نسہ کم ہو گا تو آبے گا۔"

ڈوری لال کی بات سنتے ہی چمپا کا چہرہ کُمہلا گیا۔ اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور کواڑ بند کر کے کُنڈی لگا دی۔

بھلا خود ہی تو وہ پھول لایا تھا کہتا تھا ان پھولوں کی سُگندھ مجھے بہت بھلی لگے ہے چمپا ان پھولوں کی مالا بنا کر بالوں میں ٹانک لیجو رام کسم جب تیرے ماس کی مہک پھولوں کی سُگندھ میں مل کر آبے ہے تو تھرّے کی طرح سیدھی سنسناتی ہوئی میرے دماگ کو گرم کر دیت ہے، پھر اس کے بعد پینے کی جرورت بھی نہیں رہتی۔ اگر تو روج روج یہ پھول اپنے بالوں میں ٹانک لیا کرے تو میں کاہے کو بھٹی کا منہ دیکھنے جایا کروں لیکن آج حرام جادے

کو کیا ہو گیا۔ آج پھر وہ بھٹی پر چلا گیا۔ میں تو روج روج اسی کی کھاتر بنتی سنورتی رہی کہ کسی طرح اس کی یہ پینے پلانے کی عادت چھوٹ جائے۔

چمپا بڑبڑاتی ہوئی چوکے میں داخل ہو گئی۔ چولہے میں سُلگتی ہوئی لکڑی اس نے کھینچ کر راکھ میں دبا دی پھر لالٹین کی لَو مدھم کر کے ہاتھ منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ اب آئے دیکھو دروجہ کون کھولت ہے۔

آہستہ آہستہ اس کا غصہ کم ہوا تو اس نے سوچنا شروع کیا۔ رامو جیسا بھی ہے پر ہے تو اس کا دیوانہ ہی۔ بس دو کھرابیاں اس میں ضرور رہیں بھٹی پر جانا اور جوا کھیلنا اس کو سنگت کھراب کیے ہوئے ہے ورنہ رامو تو بہت بھلا آدمی ہے آج چار سال ہونے کو آر ہے تھے دونوں کے بیاہ کو اب تک کوئی اولاد نہیں ہو سکی لیکن رامو نے دم بھی نہیں مارا کسی اور کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا بیاہ سے پہلے وہ اس کی محبت کا دم جیسا بھرتا تھا آج تک ویسا ہی پیار کرتا آرہا ہے۔

وہ ایک کہار کی بیٹی تھی۔ سانولی سلونی تیکھے نقوش والی۔ اس کی کمر جتنی پتلی تھی سینہ اتنا ہی اُبھرا ہوا تھا۔ رامو جو کہ ایک کائستھ تھا اس پر مر مٹا دونوں کی شادی ناممکن تھی مگر رامو نے چمپا پر کچھ اس طرح اپنا پیار جتایا کہ اسے اس کے جذبے کی سچائی پر یقین کرنا ہی پڑا اور وہ گاؤں سے رامو کے ساتھ یہاں اس قصبے میں چلی آئی جب سے اب تک رامو اسے ٹوٹ کر پیار دے رہا تھا مگر بُرا ہو اس صحبت سنگت کا جس کارن اس کے پیار میں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔

چمپا انھیں خیالات میں گم تھی کہ دروازے پہ کھٹکا ہوا وہ چُپ چاپ اُٹھی اور جا کر کُنڈی کھول دی۔

رامو نے جیسے ہی ڈیوڑھی میں قدم رکھا شراب کا ایک زوردار بھپکا در آتا ہوا اندر گھس آیا۔ چمپا نے ساری کے آنچل کا ڈھاٹا لگایا اور پیچھے سرک کر کواڑ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ رامو جھومتا ہوا اندر داخل ہوا۔

سیاں دل میں آنا رے آکے پھر نہ جانا رے او چھم چھما چھم چھم او چھم چھما چھم چھم

گاتے گاتے راموکو ایک ٹھوکر لگی اور اس سے قبل کہ وہ منہ کے بل گر پڑے چمپا نے تڑپ کر اس کو سنبھالا۔

"رانی اندھیرا کیوں ہے کیا کھاپی کر سوگئی تھیں؟"

رانی منہ سے کچھ نہیں بولی۔

لالٹین کی بتی اونچی کی اور راموکا ہاتھ پکڑ کر چوکے میں لے گئی پھر چپ چاپ کھانا اس کے آگے رکھ کر دوبارہ آکر لیٹ گئی۔

رامو نے ہانک لگائی "کا تم کھاپی چکیں؟"

چمپا کچھ نہیں بولی۔

تو وہ پھر بڑبڑایا "رانی ہمار رانی بھلا ہمیں چھوڑ کر کاں کھات پیت ہے" پھر وہ منہ اُوپر اُٹھا کر بولا "ارے آؤ بھی ورنہ ہم بھی نہیں کھات۔"

جواب پھر بھی نہیں ملا۔

تو وہ اُٹھا اور اس نے چمپا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا لیکن نشے میں دُھت طاقت کہاں سے لاتا؟

چمپا صرف ہل کر رہ گئی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی جب وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تو رامو نے برافروختہ ہوکر گالی دی "سالی رانی جات تیری ماں..." اور پھر چمپا کے بال پکڑ کر کھینچنے لگا۔ نشے میں چُور کانپتے ہاتھوں کی مُٹھی میں پھولوں کی مالا پھنس گئی۔ رامو نے جھٹکا دیا تو کچا دھاگا ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں جھول گیا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لے کر پھولوں کو سونگھا اور جھک کر ان پھولوں کو چمپا کے سر پر سجادیا پھر اس کے سر اور پیشانی پر اپنی ناک رگڑ رگڑ کر لمبے لمبے سانس کھینچنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاصہ جذباتی ہوگیا اور چٹاچٹ چمپا کو پیار کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

"رانی ہم کا معاف کردے ہم بہت کھراب اور حرامی آدمی ہیں ہم تو ہار کابل ناہیں۔"

چمپا دانت پیستی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی راموا چانک چمپا سے لپٹ گیا اور نشے

کی ترنگ میں رونے لگا۔

رامو کو روتے دیکھ کر چمپا کے غصّے کی آگ چھن چھن کرتی ٹھنڈی پڑتی چلی گئی جیسے کوئی جلتی لکڑی پانی بھری بالٹی میں ڈبو دے اور پھر خفیف سے دھوئیں کے ساتھ ہلکی گرمی لکڑی میں رہ جائے۔ چمپا بھی ہلکی برہمی لیے تیکھے لہجے میں بولی "اچھا ختم کرو یہ ناٹک چلو کھانا پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے چل کر کھالو۔"

دوسرے دن جب رامو کام پر جانے لگا تو چمپا نے سوال کیا "آج کیا ارادہ ہے بھٹی پر جاؤ گے؟"

"ارے نہیں۔" پھر اس نے اپنے دونوں کان پکڑے اور باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "تو ہار کسم اب ناہیں جائیں۔"

"تو بھول لیتے آنا" یہ کہہ کر چمپا خود ہی شرما گئی۔

دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن شام کے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ چمپا نے دروازہ کھولا تو سامنے بدری اپنے چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ لیے کھڑا نظر آیا۔ چمپا کو اس کی تیز نگاہیں تیر کی طرح اپنے جسم کے اندر اُترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اُسے بدری کی صورت سے نفرت تھی۔ وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی اس کے مرد کو خراب کرنے میں اسی حرامی کا ہاتھ ہے بدری تھا بھی بہت پاجی نیت کا خراب جب بھی اس کا سامنا ہوتا تو وہ محسوس کرتی بدری کی درشٹ نگاہیں کپڑوں کے پار اس کے جسم کو ٹٹول رہی ہیں۔

چمپا نے کواڑ کی اوٹ سے پوچھا "کا بات ہے...؟"

بدری کھنکارا اور اپنے چہرے پہ دلکشش جیسی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا "جرا رامو کو باہر بھیجو اس سے کام ہے۔"

چمپا بغیر کچھ جواب دیے اندر چلی گئی اور رامو کو جا کر بتلا دیا کہ بدری باہر اس کا انتظار کر رہا ہے۔

کچھ دیر بعد باہر سے گالم گلوچ کی آوازیں آنے لگیں تو چمپا نے کواڑ کی اوٹ

سے باہر جھانکا۔ دیکھا باہر گلی میں بھیڑ لگی ہے۔ بدری اور رامو جھگڑ رہے ہیں۔
معاملہ کیا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے چمپا لمبے لمبے قدم بڑھاتی وہاں پہنچی تو معلوم ہوا رامو کچھ روپیہ جُوئے میں ہار گیا تھا۔ وہ روپے اس نے ابھی تک بدری کو نہیں دیے ہیں۔ بدری انھیں روپیوں کی وصولیابی کے لیے آیا ہے۔ اور اسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔
وہ ابھی تک پوچھ تاچھ کر ہی رہی تھی کہ بدری کی نظر چمپا پر گئی تو وہ بولا "سالے تیرے پاس پیسے نہیں ہیں تو اپنی جورو کو کچھ دن کے لیے دے دے سب روپے معاف کر دوں گا۔"
رامو نے جب چمپا کا نام سُنا تو وہ طیش میں آگیا۔ اس نے بدری کے منہ پر ایک تھپّڑ جڑ دیا۔ پھر کیا تھا دونوں لپٹ گئے پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے دونوں کو روکا ورنہ خون خرابہ ہو جاتا۔
چمپا کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر رامو کو گھر تک لے گئی۔
لیکن بدری نے پیچھا نہیں چھوڑا وہ گھر میں گھُس آیا۔ چمپا رونے لگی تو بدری بولا "رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ میں روپیہ لیے بغیر نہیں ٹلوں گا۔
چمپا نے آنسوؤں سے تر اپنا چہرہ اٹھا کر بدری کو بڑی بے چارگی اور رحم طلب نظروں سے دیکھا لیکن وہاں اس کے چہرے پہ بجائے ترحم کے شیطنیت رقصاں تھی۔ بدری کی آنکھوں میں ہوس کے بادل منڈلاتے دیکھ کر چمپا کی آزردگی نفرت کے اُبال میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور بغیر منہ سے کچھ بولے سیدھی کوٹھری میں چلی گئی اور ایک ٹین کا ڈبہ لا کر اس نے بدری کے سامنے اُلٹ دیا۔ کھنکھناہٹ کے ساتھ چاندی کے کچھ زیور زمین پر بکھر گئے۔ پھر ایک نفرت انگیز کرخت آواز گونجی ــــ "لو اپنا من شانت کر لو۔"
بدری نے زیوروں کو ہاتھ میں لے کر تولا اور بڑی حقارت سے بولا "اس سے پور نہیں پڑے گی۔"
"پور نہیں پڑے گی کتنا کرجہ ہے...؟" یہ کہتے کہتے چمپا کی آنکھوں سے آبشار جاری ہوگیا۔ وہ رُندھی ہوئی پست آواز میں بولی "بھگوان کسم اس سے جیادہ اور کچھ

ہمار پاس ناہیں ہے۔ تم چاہو تو تلاشی لے لو۔"

بدری نے گہنے سمیٹے، کچھ دیر سوچا پھر گردن ہلائی اور دروازے سے نکل گیا۔

چمپا نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کی کُنڈی لگائی اور پھر جو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا تو سیلاب بہا دیے۔ گھٹا اُمڈ کر آئی تھی، برستی تھی پھر اُمڈ آتی تھی۔ آدھی رات بیت گئی۔ رامو منت سماجت ہی کرتا رہا کہ چُپ ہو جا میں گہنے اور بنوا دوں گا۔ آخر کار بغیر کھائے پیے وہ بھی سو گیا اور چمپا بھی روتے روتے تھک کر کسی وقت سو گئی۔

اپنے گہنے جانے کے غم میں چمپا کچھ دن تو سوجی پھولی رہی پھر آہستہ آہستہ معمول پر آگئی اور وہ تھی بھی اپنی طبیعت سے ایسی ہی غم کے روگ کو وہ زیادہ دن نہیں پالتی تھی اس کے لیے یہی کیا کم تھا کہ رامو آج کل وقت سے گھر واپس آ رہا تھا اور وہ بھی بن پیے۔

لیکن کب تک چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔ آخر کو اس خوشی میں کھنڈت پڑی اور پھر ایک روز چمپا بالوں میں پھول سجائے۔ انتظار کی گھڑیاں گنتی رہی وقت گزرتا رہا جب تھک گئی اور اُسے آبا سیاں آنے لگیں تو اس نے مایوس نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھا اور کھاٹ پر آ کر لیٹ گئی۔ رات گئے کُنڈی کھٹ کھٹانے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے اُٹھ کر خاموشی سے دروازہ کھول دیا۔

رامو منہ لٹکائے ہوئے اندر داخل ہوا۔

چمپا نے حسب عادت ناک پر ڈھاٹا لگایا مگر یہ کیا... ٹھرے کی باس کا وہاں دور دور تک پتہ ہی نہیں تھا اس نے ایک جھٹکے سے منہ پر لگا ہوا کپڑا ہٹایا پھر گہری گہری دو تین سانسیں کھینچیں تو اسے گجرے کی میٹھی میٹھی مہک کا احساس ہوا اور ٹھنڈی ٹھنڈی شفاف ہوا اس کے پھیپھڑوں میں گھستی چلی گئی۔ حیرت سے اس کی پلکیں کئی بار جھپکیں پھر فوراً ہی اس نے اپنی گردن دروازے کے باہر نکالی اور گلی کی جانب منہ کر کے ایک لمبا سانس لیا۔ نالی کے گندے پانی کا بھپکا اس کے حواس سے ٹکرایا تو چمپا پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"تو... تو کیا رامو پی کر نہیں آیا ہے؟"

کیوں کہ وہ رات کو جب بھی دیر سے گھر آتا۔ نشے میں ہی ہوتا آج رات گئے لوٹا ہے تو بھی پی کر نہیں آیا ہے۔

چمپا کا تجسس بڑھا اس کے جی میں آیا کہ پوچھے آخر معاملہ کیا ہے جب بھٹی پر نہیں گیا تو اب تک کہاں رہا مگر غصے کی زیادتی نے اس کی زبان بند کر دی تھی وہ چپ چاپ کھانا نکالنے چوکے میں چلی گئی۔

کھانا نکال کر وہ واپس آئی تو دیکھا رامو اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھے چوکی پر اُکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ چمپا نے کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا نہ ہی اس نے آنکھ اُٹھا کر کھانے کی جانب دیکھا۔

اب چمپا سے برداشت نہیں ہوا وہ تڑخ کر بولی "کا بات ہے؟ کا کوئی مر گوا ہے؟"

رامو نے اپنا سر اوپر اُٹھایا تو اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے قطرے لرز رہے تھے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "ہاں چمپا آج میں مر گیا ہوں میری گیرت (غیرت) سرابھیت سب مر گئی ہے۔"

چمپا نے آج تک رامو کو اس سنجیدگی سے روتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جو رامو کو روتے دیکھا اور اس کی درد میں ڈوبی گمبھیر آواز سُنی تو محبت کا دریا اُمنڈ آیا سُن سن کر کے اس کا دل پگھلنا شروع ہو گیا اور آن کی آن میں اس کا سارا کا سارا غصہ کافور ہو گیا پھر اس کی وہی رسیلی آواز سُنائی دی "بات کا ہے رے...؟"

"چمپا مجھے معاف کر دے۔ بہت کھرابی ہو گئی ہے۔" رامو کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"کا کھرابی ہو گئی ہے تو کا اُلٹی پلٹی بکے جات ہے۔"

رامو پھر رونے لگا اور چمپا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر بولا "چمپا! گجب ہو گوا، میری کسمت پھوٹ گئی میں تجھے جوئے میں ہار آیا ہوں... میں تیرے گہنے چھڑانے کے لیے آج بدری کے یہاں چلا گیا تھا قسمت میں ہار لکھی تھی جب جیادہ رکم ہار گیا تو بدری نے پوچھا" گہنے پاتے تو سب ہی دے بیٹھے ہو اب اور رکم کہاں سے پوری کرو گے؟"

میں کیا جواب دیتا چُپ ہو رہا، تو بدری بولا "میں ایسے نہیں جانے دوں گا سب کے سامنے اکرار کرنا ہوگا کہ تم ایک ہفتہ کے لیے چمپا کو میرے پاس چھوڑ دو گے۔ یہ سُن کر میں آگ بگولہ ہو گیا۔ نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ سب نے بیچ بچاؤ کرا دیا لیکن بدری مجھے واپس آنے نہیں دے رہا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد پھیصلہ ہوا کہ مجھے ایک موکا اور دیا جائے۔ میں ایک باجی اور کھیلوں۔ اگر جیت گیا تو جیت گیا اور ہار تو بدری کی بات ماننا ہی پڑے گی۔

میں راجی نہیں ہو رہا تھا تو لالو نے مجھے پٹی پڑھائی بھگوان پر بھروسہ رکھ اور کھیل جا ایک باجی۔ بھگوان کی اِچھا ہوگی تو تیری عورت تیرے پاس ہی رہے گی اور اگر بھگوان کی مرضی نہیں ہوئی تو تو بھی کیا کر سکتا ہے۔ ویسے بھی تو چھنس چکا ہے۔ ایک ہفتے کے لیے تو تجھے اپنی عورت دینا ہی پڑے گی۔ اس سے اچھا ہے جندگی بھر کی باجی کھیل جا۔ اور پھر ہمارے سماج میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔"

جب سب طرف سے دباؤ پڑا تو میں مجبور ہو گیا اور تیری باجی بھی لگا بیٹھا۔ لیکن میری کسمت کھراب ہے میں تجھے ہار آیا ہوں۔"

رامو کے الفاظ چمپا کے حواس پر بجلی بن کر ٹوٹے، ایک تڑاکا ہوا اور محبت و الفت کی وہ مضبوط عمارت جس کی خاطر اس نے اپنے ماں باپ کو تج دیا تھا اڑا اڑا دھڑام کرتی نیچے آ گری اور وہ بھروسے اور اعتماد کے ٹوٹے پھوٹے پتھروں میں دبی سسکنے لگی۔ اس کے منہ سے دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں اور جب نفرت اور کراہیت کی خاک سے اس کا منہ اَٹ گیا تو اس کی چیخیں رُک گئیں اُس کا دل ڈوبنے لگا اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ آسمان سے نیچے گر رہی ہے، گرتی ہی جا رہی ہے نیچے اور نیچے، اس سے قبل کہ زمین آ جائے اور اس کا وجود زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ بیہوش ہو گئی۔

رامو جیسے سکتے کے عالم میں خاموش لیٹا چھت کی جانب تکتا رہا۔

صبح دم جب رامو کی آنکھ کھلی اُس نے دیکھا چمپا بے خبر سو رہی ہے۔ اب اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ چمپا سے آنکھ ملائے وہ چُپ چاپ اُٹھا اور باہر چلا گیا۔

چمپا کی جب آنکھ کھلی تو رامو کو نہ پاکر اسے حیرت ہوئی پھر وہ سمجھ گئی دوپہر تک اس نے ایک فیصلہ کیا دروازے کی کنڈی لگائی اور انجان راہوں پر نکل کھڑی ہوئی۔

رات کو جب رامو گھر واپس آیا تو اس کے ہمراہ بدری بھی تھا۔ دروازے پہ کنڈی لگی دیکھ کے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کنڈی کھولی اور اندر گیا پھر آس پڑوس والوں سے چمپا کے بارے میں معلومات کی کسی سے کچھ معلوم نہ ہو سکا رامو بدحواس ہو گیا اس نے پورا شہر چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلا۔ دن بہ دن مایوسی بڑھتی رہی۔ اس نے چمپا کے غم میں شراب کو دوبارہ گلے لگا لیا کوئی سمجھانے والا بھی نہیں تھا اس لیے بات بڑھتی گئی۔ یاد زیادہ پریشان کرتی تو وہ چڑھاتا ہی چلا جاتا۔ اکثر اتنا مدہوش ہو جاتا کہ سُدھ بدھ کھو بیٹھتا اور گھر واپس آنے کے قابل بھی نہیں رہتا وہیں بھٹی کے تھلے پر پڑا رہتا اور ہر آنے جانے والے سے سوال کرتا "اے بھائی تم نے چمپا کو دیکھا ہے۔ اکثر بھیڑ لگ جاتی کچھ لوگ اس پر ترس کھاتے تو کچھ دھتکار بھی دیتے۔ وہ کبھی محلّے کی املی کے درخت کے نیچے آکر لیٹ جاتا۔ اس سے گھر جانے کو کہتے تو بے اختیار رونے لگتا اور کہتا "چمپا کے بغیر اب گھر میں کیا رکھا ہے۔

لوگ اس پر خفا ہوتے کہ تو نے ہی تو اپنے کرموں سے چمپا کو گھر سے نکالا ہے۔ وہ بیچاری نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہوگی۔

ایک دن رامو کام سے جلد واپس آ گیا۔ ابھی اس کو گھر میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا دیکھا تو امیر خاں تھے جو ریلوے اسٹیشن پر قلی گیری کا کام کرتے تھے۔ "اندر آنے کو نہ کہو گے بھیا؟"

"آؤ آؤ بھلا ہم کون رئیس جا دے ہیں جو نکھراد کھلا دیں گے" رامو مسکرا کر بولا۔

امیر خاں نے کھاٹ پر بیٹھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ "میں تمھیں ایک ضروری بات بتلانے آیا ہوں۔ دن میں میں اور تم اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں رات کو تم اپنے ہوش میں نہیں ملتے ہو تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"ایسی کیا بات ہے بھیا بولو؟" رامو نے بڑا اشتیاق لہجے میں کہا۔

اس روز چمپا مجھے اسٹیشن پر ملی تھی تو میں نے اس کو کلکتے والی ٹرین میں بٹھا دیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ تم کلکتے جاکر اس کو تلاش کرو میرے خیال سے وہ سُندر لال کے یہاں پہنچی ہوگی کیوں کہ وہ مجھ سے کلکتے میں ٹھہرنے کا ٹھکانہ پوچھ رہی تھی تو میں نے اس کو سُندر لال کا پتہ بتلادیا تھا۔

"سُندر لال کون؟"

"بھیا وہ اپنے بہاری لال کا بڑا بیٹا سُندر جو کلکتے میں کام کرتا ہے میں بھی تو کلکتے میں کچھ دن کام کر آیا ہوں۔ تم ہوش میں آؤ، نشہ چھوڑو اور کلکتہ جاکر اس کو تلاش کرو۔"

رامو تڑپ گیا "بھیا تم نے یہ بات اب اتنے دن بعد بتلائی ہے۔"

"تم ہوش میں ملتے تب نا... میں نے تمھیں جب بھی دیکھا مدہوش ہی دیکھا اب تم جلدی سے ٹکٹ کٹاؤ کلکتے کا۔"

رامو نے خوشی سے امیر خاں کو گلے لگالیا اور بولا "بھیا تم میرا پرسوں کا ٹکٹ کٹادو میں اپنا جانے کا انتجام کرتا ہوں۔"

رامو کلکتہ پہنچا تو سُندر لال رامو کو دیکھ کر حیران رہ گیا "بھیا تم... جندہ ہو چمپا تو کہت رہی رامو مر گیا۔"

"ہاں بھیا ابھی تک تو جندہ ہی ہیں پر چمپا کہاں ہے؟"

جواب میں سُندر لال اپنا سر کھُجلاتے ہوئے بولا "بات یہ ہے اس کا کچھ روز سے کوئی پتہ نہیں ہے۔ وہ کام کی تلاش میں بھٹک رہی تھی کہ کچھ غنڈے اس کے پیچھے لگ گئے۔ بڑی مردانی عورت تھی ٹکرا گئی۔ پولیس سب کو پکڑ کر لے گئی تھی میں نے پولیس کی مُٹھی گرم کر دی تھی۔ پولیس کا کہنا تھا بیان ہو جائے تو کل چھوٹ جائے گی پرنتو جب میں دوسرے دن گیا تو پتہ چلا لڑکوں نے معافی مانگ لی۔ صلح صفائی ہو گئی رات ہی پولیس نے سب کو چھوڑ دیا پر چمپا گھر نہیں پہنچی۔

یہاں اس کمرے میں چھ مرد لوگ سوتے ہیں وہ باہر برآمدے میں سوتی تھی ہو سکتا ہے اس کو کام مل گیا ہو اور رہنے کی جگہ بھی پر ہم کو بول تو جاتی۔ کتنے دن سے اس کی صورتیا بھی نہیں

دیکھی۔

سُندر لال کے آخری جملے کو سُن کر رامو کا دل ڈوبنے لگا۔ اُمید کی وہ کرن جو روشنی بن کر جھلملا رہی تھی معدوم ہو گئی۔ اب پھر مایوسی کے مہیب اندھیرے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ رامو کچھ دیر خاموش بیٹھا مایوس نگاہوں سے سُندر لال کا چہرہ تکتا رہا پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "بھیا چمپا کو تو ڈھونڈنا ہی ہوگا چاہے جو ہو جائے۔ مہمانی ایک دن کی دو دن کی تم میرے کام کا بندوبست کر دو تو میں یہاں ہی رہ پڑوں۔"

پھر رامو کو ایک کارخانے میں کام بھی مل گیا اور اس نے بڑی تندہی سے چمپا کی تلاش شروع کر دی لیکن کلکتے جیسے آدمیوں کے جنگل میں کسی کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

اب جب جیب میں پیسے آنے لگے تو پُرانی لت بھی یاد آئی پھر اسے ایسے یار دوست بھی مل گئے جن کے ساتھ بیٹھ کر وہ مستیاں کیا کرتا جب آپس میں بے تکلفی بڑھی تو بات بھی آگے بڑھی نوبت یہاں تک پہنچی کہ رامو کے قدم اب چکلوں کی جانب بھی بڑھنے لگے۔ اسی طرح کی ایک رات کو وہ چکلے میں پہنچا تو دلال نے کہا "ایک بالکل نیا مال آیا ہے پر وہ کسی کو پھٹکنے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔ تم خوبصورت ہو، گبھرو جوان ہو جاؤ قسمت آزما کر دیکھو ہم تو سب جتن کر کے ہار گئے پھر بھی سالی جائے گی کہاں۔ آج نہیں تو کل راضی ہوگی۔" پھر اس نے بیڑی کا ایک لمبا کش کھینچا اور رامو کو ایک دالان میں پہنچا دیا۔ سامنے لٹکتا ہوا ایک میلا سا پردہ اُٹھا کر وہ اندر داخل ہوا تو بوکھلا کر اُچھل پڑا۔ گویا اس کے سامنے پھن کاڑھے کوئی ناگ کھڑا ہو۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ کئی لمحوں تک وہ یوں ہی ساکت سامت کھڑا رہا پھر بمشکل تمام اس کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی "چم چم... چم پا..."

بھونچال

"اے ہے رضیہ آپا آرہی ہیں" کسی نے ہانک لگائی۔ پھر کیا تھا سب لڑکیوں نے جلدی جلدی اپنے دوپٹے درست کیے اور جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کر دیا۔

"نماز کسی بھی حالت میں ترک نہیں کی جاسکتی اگر وضو کے لیے پانی میسر نہ ہو تو تیمم کرو، تیمم کا طریقہ..."

"ہائیں میں آدھے گھنٹے بعد واپس آئی اور تم ابھی تک تیمم پر ہی اٹکی ہوئی ہو"۔ رضیہ آپا نے کلاس میں داخل ہوتے ہی آنکھیں نکالیں۔

رضیہ آپا کی ڈانٹ سنتے ہی تمام لڑکیوں کا دم نکل گیا۔ انھوں نے کن انکھیوں سے رضیہ آپا کی جانب دیکھا اور پھر فراٹے بھرنا شروع کر دیے۔ یوں تو رضیہ آپا بہت ہنس مکھ اور نہایت ہنسوڑ تھیں۔ اس طرح مسکرا مسکرا کر باتیں کیا کرتیں کہ محسوس ہوتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں لیکن وہ پڑھائی کے معاملے میں بہت سخت تھیں۔

وہ ہمارے اسلامیہ گرلز ہائی اسکول کی ٹیچر تھیں۔ حساب اور الجبرا ان کا بہت پکا تھا۔ ہیڈ مس تک ان سے دبتی تھیں۔ ویسے کیا اردو کیا انگلش اور کیا جنرل نالج سب سبجیکٹ میں ہی ان کو مہارت تھی۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا رضیہ آپا سے ٹیوشن پڑھو اور فرسٹ آؤ۔ ہر لڑکی انھیں سے ٹیوشن پڑھنا چاہتی لیکن وہ اپنی مرضی سے ہی خاص خاص ٹیوشن لینا پسند کرتی تھیں۔

ٹیوشن وہ اپنے گھر پر ہی پڑھایا کرتیں اور ہمیشہ ان کی منظور نظر لڑکیاں ہی فرسٹ اور سیکنڈ آتیں۔ مجھے ان سے چڑ سی تھی کیوں کہ وہ کبھی کبھی مجھے عجیب بھوکی نظروں سے گھورا کرتیں تو میں کٹ کر رہ جاتی۔ میں ہمیشہ اُن کے قرب سے کتراتی تھی۔

ایک مرتبہ بارہ وفات کے موقع پر اسکول میں مجھے قرأت کے لیے مائک پر جانا پڑا تو گھبراہٹ اور بے خیالی میں مَیں دوپٹے کا پلّو سر پر ڈالے بغیر ہی ڈائس پر پہنچ گئی اور جیسے ہی میں نے اَعُوذُ شروع کی "ہائیں ہائیں ... یہ کیا!" کی آواز آئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو رضیہ آپا آنکھیں نکالے سر پر سوار تھیں۔

"ارے لڑکی! دوپٹہ تو سر پر ٹھیک کر لے۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے مائک میرے آگے سے کھینچ لیا۔

پھر جب تک دوپٹہ سر پر رکھ کر میں نے کانوں تک محراب نہ بنا لی انھوں نے مائک میرے سامنے نہیں کیا۔

سامعین لڑکیوں نے مُسکرا کر مجھے دیکھا اور رضیہ آپا کی چاروں چہیتی لڑکیوں جمیلہ، نُزہت، سعیدہ اور سلمہ نے قہقہے لگائے۔ اس محفل میں جہاں سب ٹیچرز نزدیک بیٹھی ہوں یوں ہنسنا بہت بے ادبی کی بات سمجھی جاتی ہے مگر رضیہ آپا کی چہیتیوں کے لیے سب روا تھا تبھی سے میں رضیہ آپا اور ان کی منظورِ نظر لڑکیوں سے اندر ہی اندر جلنے لگی۔

نویں جماعت سے جب نصاب سخت ہو جاتا ہے میرے گھر والوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رضیہ آپا سے ٹیوشن پڑھوں تو میں نے صاف انکار کر دیا

"وجہ؟"

وجہ میں کیا بتلاتی یہی کہ وہ مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ وہ ہنستی بہت ہیں۔

"ارے نہیں بیٹا ایسے نہیں کہتے۔" اماں نے رضیہ آپا کی حمایت کی۔ "وہ بیچاری تو شریف اور بہت ہی نیک نفس ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی خلق کی خدمت کی نذر کی ہوئی ہے۔ اُجالا پھیلا رہی ہے اور اُجالا بھی کیسا ماشاءاللہ دینیات کی تعلیم دیتی ہے۔ بہت باوصف ہے۔ مجھے تو اُس پر ترس آتا ہے۔ بے چاری کے بھاگ ہی خراب ہیں، میاں شرابی جواری نکلا۔ دو سال بھی نہیں نبھ سکی اور قسمت کی خوبی سے کوئی اولاد بھی نہ ہوئی

تمھیں سوچو! ایک شریف دیندار اور پھر پڑھی لکھی عورت کسی شرابی جواری سے کیسے نبھا پاتی۔ وہ کمبخت نشے میں فحش کلامی کرتا۔ اور کبھی کبھی مار کٹائی پر بھی اُتر آتا۔ اوپر سے

نکما بھی تھا جھاڑو پھرا۔ بوڑھے باپ نے لاچار ہو کر طلاق لے لی۔

حالاں کہ دوسری شادی ہو سکتی تھی۔ کیسی گوری چٹی ہے اُوپر سے کٹورا سی آنکھیں۔ قربان جاؤں اس کے چہرے پہ بہت ہی بھلی لگتی ہیں۔ پھر ماشاء اللہ تعلیم کے زیور سے آراستہ مگر قسمت کی ہیٹی ہے۔ پیغام آئے تو کمبخت بوڑھوں کے۔ آج کل موئے رنڈوے تک کنواری دوشیزہ کرنا چاہتے ہیں۔

اُس کا دل بُرا ہو گیا۔ اُس نے کہہ دیا میں ایسی ہی بھلی۔ باپ بیچارے اپنے اللہ سے جا ملے۔ ایک بھائی تھا سو وہ روزی روزگار کے لیے قصبہ چھوڑ کر شہر کو سدھار گیا۔ اب تن تنہا ہی رہتی ہے۔ خدا کسی کا بیوگی سے پالا نہ ڈالے۔

" ہا.....!" اماں جان نے ایک سرد اور لمبی سانس کھینچی " سب اس کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

میں جو اماں کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی بول پڑی " تو کیا بیچاری رضیہ آپا اللہ میاں کی ایما پر بیوہ ہوئی ہیں؟"

" نا... بیٹی نا توبہ کر توبہ پتہ نہیں وہ کب کس کا امتحان لے لے بس ہر وقت اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔"

اماں کی باتیں سن کر میرے دل کے گوشے رضیہ آپا کے لیے نرم تو ضرور ہوئے پر میں نے اُن سے ٹیوشن پھر بھی نہیں پڑھی اور خود ہی امتحان کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ لیکن جب رزلٹ نکلا تو وہی ڈھاک کے تین پات۔ یعنی نتیجہ صفر کا صفر میری محنت اکارت گئی میں فرسٹ کیا تھرڈ پوزیشن میں بھی نہ آسکی اور ادھر رضیہ آپا کی منظور نظر لڑکیاں بازی لے گئیں۔ اس مرتبہ جمیلہ فرسٹ ہوئی۔ جمیلہ جو رضیہ آپا کا دم چھلہ تھی اور الٰہی لونڈا مشہور تھی، تھی تو کالی کلوٹی پر کمبخت کا اُٹھان سب سے نرالا تھا۔ اسکول کی چھٹی ہوتی تو لڑکوں کی نظریں سب سے زیادہ جمیلہ پر ہی پڑتیں اور وہ مُردی کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتی اور جتانے کے لیے کھلکھلا کر ہنس بھی دیتی۔ اس سے لڑکوں کا حوصلہ اور بھی بڑھتا۔ دو ایک بار رضیہ آپا سے شکایت بھی کی گئی مگر ان کا جواب ہمیشہ یہی رہا " بچی ہے۔"

اور پھر جب میں دسویں جماعت میں آئی تو اماں جان نے کہا "رضیہ سے ٹیوشن پڑھ لو..."
بھائی جان نے بھی مجھے سمجھایا تو میں نے غور کیا۔ خواہ مخواہ کی اکڑ سے کیا فائدہ اللہ نے موقع دیا ہے، روپے پیسے کی سہولت بھی ہے۔ پھر وقت گنوانے سے فائدہ کیا۔ یہ سوچ کر میں نے حامی بھرلی اور اماں جان کے ہمراہ رضیہ آپا کے مکان پر جا پہنچی جو کہ ہمارے محلے ہی میں تھا۔ لیکن آج کل رضیہ آپا کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔ جب اماں جان نے بہت اصرار کیا تو راضی ہو گئیں اور مسکرا کر میرے سراپے پر پھر وہی عجیب سی بھرپور نظر ڈالی کہ میں سمٹ کر رہ گئی۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ میں ان سے اس طرح بے تکلف نہیں ہو پا رہی تھی، جیسے اور لڑکیاں گھل مل گئی تھیں۔ ایک روز چھٹی والے دن میں نے رضیہ آپا کے یہاں صبح سے پڑھنا شروع کیا تو دوپہر ہو گئی۔ میں تھک کر آرام کی غرض سے کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ جمیلہ نے مجھے دیکھا تو وہ بھی میرے پاس آکر لیٹ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ میں نے کہا بھئی، ہمیں نیند آرہی ہے، ہمیں ایک نیند لینے دو تو جمیلہ نے جل کر کہا "اللہ ہم اتنی محبت کرتے ہیں اور تم ہو کہ نخرے دکھلاتی ہو" یہ کہتے ہوئے اس نے چٹ سے میرے گال پر ایک بوسہ جڑ دیا۔ میں ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے... رضیہ آپا... او رضیہ آپا...؟"

رضیہ آپا دوڑی آئیں تو انھوں نے ہنس کر کہا "ہٹ کمبخت اس کے پاس سے تو اس کا بھی رنگ میلا کر دے گی۔ کہاں تو کالی کلوٹی اور کہاں یہ میدے کی گندھی ہوئی۔"

جمیلہ بے شرمی سے ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جوں جوں میٹرک کے امتحان قریب آتے جا رہے تھے میری مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے معمول بنا لیا تھا کہ روزانہ چار پانچ بجے تک رضیہ آپا کے گھر پہنچ جاتی اور رات آٹھ بجے تک پڑھائی کیا کرتی۔

صبح ریاضی کا پرچہ تھا۔ ہم سب لڑکیاں مل کر سر کھپا رہی تھیں۔ مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ مجھ سے بار بار بھول ہو رہی تھی تو رضیہ آپا نے کہا "تمھارا دماغ تھک گیا ہے جاؤ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ اپنے گھر کا چکر کاٹ آؤ۔ اسی لیے تو کہتی ہوں بادام پیس کر چاٹا کرو مگر تم سب لڑکیاں سنتی ہی کہاں ہو؟"

غرضیکہ میں گھر سے کھانے کے بعد جب واپس آئی تو میری ملازمہ میرے ہمراہ تھی۔ جمیلہ نے مشورہ دیا آج یہاں پر ہی سو جاؤ رات گئے تک پڑھائی کریں گے۔" میں نے بُوا سے کہہ دیا صبح مجھے لینے آجانا۔ میں یہاں پر ہی سو رہوں گی۔"

پھر تو وقت کا ہوش ہی نہ رہا۔ جب آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو گھڑی دو بجا رہی تھی۔ رضیہ آپا کب کی سو چکی تھیں۔

اُن کے یہاں دالان میں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک لمبا تخت بچھا تھا۔ اُس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ موسم معتدل تھا پر رات کو کچھ خنکی ہو جاتی تھی۔ ایک دُلائی سے کام چل رہا تھا۔ تخت کے داہنے جانب رضیہ آپا سو رہی تھیں۔ بائیں جانب الگ تھلگ میں لیٹ گئی اور جمیلہ درمیان میں آگئی۔

چوں کہ میں بہت زیادہ تھک گئی تھی لہٰذا لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچی۔

میں دسویں جماعت میں فرسٹ آگئی ہوں۔ گھر میں سب خوش ہیں۔ ابا جان حسب وعدہ ہم سب کو گھمانے دہلی لیے جا رہے ہیں۔ سامان بندھا کسا رکھا ہے بس تانگے کا انتظار ہے کہ آواز آئی۔ "برف چُسکی کا برف ٹھنڈائی والا۔"

سب بچے شور مچانے لگے۔ برف کھائیں گے برف کھائیں گے۔ برف والا اُلٹے رندے پر برف گھس رہا تھا۔

"یہ کمبخت مُنّی تو ہمیشہ کی بے تمیز ہے ماری گئی کیسے زور زور سے چُسکیاں لگا رہی ہے چُسر چُسر، تمیز سے برف کھانا تو، جب بھی کچھ کھاتی ہے ہمیشہ کُتّوں کی طرح ہی پسڑ پسڑ کیا کرتی ہے۔"

بچے آپس میں لڑ جھگڑ ہی رہے تھے کہ تانگہ آگیا۔ آج تانگہ کچھ زیادہ ہی جھٹکے دے رہا تھا۔ غالباً سڑک خراب تھی۔ مجھے تو ہچکولے سے بڑا لطف آرہا تھا۔ پھر ہچکولے بڑھتے ہی گئے۔ معلوم ہوتا تھا تانگہ سڑک پر کھیتوں میں دوڑ رہا ہے۔

— اور پھر ہچکولے اتنے بڑھے اتنے بڑھے گویا بھونچال آگیا ہو۔ میری چھوٹی بہن مُنّی رونے

لگی مگر یہ رونے کی آواز تو نہیں تھی صرف سسکاریاں تھیں۔ اچانک مجھے سردی کا احساس ہوا سردی بڑھتی گئی اور ہچکولے بھی۔ تانگے کے اُلٹ جانے کے خوف اور سردی کے ملے جلے احساس سے میرے دانت بجنے لگے۔ بھونچال دھیرے دھیرے ختم ہوتا گیا لیکن ٹھنڈک بدستور رہی اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ چڑیاں چُوں چُوں کر رہی تھیں گویا صبح ہو گئی ہے۔ دُلائی میرے اوپر سے اُتر کر تخت کے نیچے گر گئی تھی۔

سامنے مدھم سا بلب جل رہا تھا۔ میں نے اپنے حواس درست کیے اور چاہتی ہی تھی کہ دُلائی اُٹھا کر اوڑھ لوں کہ جمیلہ کی سسکاری سی سُنائی دی۔ اب جو میں نے گردن گھُما کر دیکھا تو رضیہ آپا اور جمیلہ ایک دوسرے میں عجب طرح سے گڈمڈ . . .

مجھے اندھیرے میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں اپنی دُلائی لینے اُٹھی تو ان کی جانب بھی گھوم گئی۔ رضیہ آپا آنکھیں موندے پست اور نڈھال سرہانے پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں نے ایک ہی دُلائی اوڑھ رکھی تھی جو آدھی سے زیادہ نیچے لٹک رہی تھی۔ میں آنکھیں ملتے ملتے آگے بڑھی ہائے اللہ توبہ . . .

میرا دم اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میرے مسامات سے پھوٹ نکلا۔ مارے خوف اور گھبراہٹ کے میرے پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ میں نے جیسے تیسے سلیپر پہنے، پھر دوپٹہ کہاں اور چادر کہاں . . . میں دروازے کی کُنڈی کھولتی ہوئی آندھی طوفان کی طرح اپنے گھر کی جانب بھاگی گویا بھونچال میرا پیچھا کر رہا ہو۔

مہک

نسیمہ نے ہر چند کوشش کی کہ وہ ہاتھ سے پھسلتے ڈبے کو قابو میں کر لے لیکن وہ پھسل ہی گیا اور سیدھا نیچے رکھے کنستر پر جا گرا۔ ایک زوردار دھڑام کی آواز ہوئی۔ نسیمہ جو ایک اسٹول پر چڑھی ہوئی تھی گرے ہوئے ڈبے کو دیکھنے کے لیے جوں ہی خمیدہ ہوئی گھبراہٹ میں اس کی کہنی پلیٹوں سے جا ٹکرائی تو وہاں پر رکھی چینی کی پلیٹوں کی تھاک نسیمہ کی پر زور بوکھلاہٹ کی متحمل نہ ہو سکی اور سب پلیٹیں نیچے آ رہیں۔

اب کے بہت زوردار چھناکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دو مختلف کمروں سے نسیمہ کی ساس اور نند کی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں "ارے کیا ہوا...؟ کیا توڑا...؟ کیسی قیامت مچی ہوئی ہے؟"

پھر وہ دونوں ہی باورچی خانے کی جانب لپکیں۔

بے چاری نسیمہ جو دیوار گیر سے دال کا ڈبہ اُتارنے اسٹول پر چڑھی تھی گھبرا کر نیچے اُتر گئی کیوں کہ ڈبہ تو خود ہی اُتر کر باورچی خانے کے باہر آنگن تک لڑھکتا ہوا چلا گیا تھا۔ اور بکھری ہوئی دال اپنی زبانِ حال سے نسیمہ کی شکایت کر رہی تھی۔

دال کی فریاد سنتے ہی نسیمہ کی ساس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور جب وہ باورچی خانے میں پہنچیں تو ٹوٹی ہوئی پلیٹوں نے بھی اپنی شکستہ حالی کا رونا رو دیا۔ اُن کی حالتِ زار دیکھ کر پہلے تو وہ دم بخود ہو گئیں، پھر ایک گہرے سانس کے ساتھ ہی غصے میں جو خون کی روانی تیز ہوئی تو گردن کی رگیں پھول کر باہر آ گئیں۔ تنفس تیز ہوتا چلا گیا۔ آنکھیں سرخ ہو کر پھیل گئیں۔

ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا "شاباش، صدر رحمت ہے تجھ پر۔"

اتنے میں دوسری جانب سے نسیمہ کی نند ذکیہ بھی آپہنچی اور اپنے داہنے ہاتھ سے پیشانی تھامتے ہوئے بولی "ہائے غضب... چینی کی پلیٹیں سب کی سب توڑ ڈالیں۔ یہ نئی پلیٹیں میں نے اُٹھا کر الگ رکھ دی تھیں کہ کوئی مہمان آئے جائے گا تو کام میں آئیں گی۔ اچھے برتنوں سے گھر کی عزت ہوتی ہے۔ پھر یہ پلیٹیں گریں کیسے؟"

"وہ... وہ میں دال کا ڈبہ اُتار رہی تھی دیوار گیر سے۔"

"دال کا ڈبہ...؟" دونوں ماں بیٹی بیک وقت چیخیں "ارے دال کا ڈبہ دیوار گیر پر کیسے چلا گیا؟ وہاں تو نئے برتن رکھے رہتے ہیں۔ بھلا دال اوپر اُٹھا کر کون رکھتا ہے؟"

"میں نے رکھی تھی۔" گویا تھانیدار کے سامنے مجرم نے اقرار کیا۔

"ٹھیک ہے رکھی تھی، تو اب پلیٹیں بھی اپنی اماں کے گھر سے لانا۔" آنکھیں نکال کر نسیمہ کی ساس زبیدہ بی بولیں۔

"پہلے جہیز تو لے آئیں اپنی اماں کے گھر سے۔" نسیمہ کی نند ذکیہ نے ٹکڑا لگایا۔

جہیز کا نام سنتے ہی نسیمہ بھول کر یوں غرائی جیسے کوئی کڑک مرغی کو پکڑ کر ڈربے کے باہر پھینک دے پھر وہ تلملا کر برجستہ بولی "کیوں کیا میں جہیز نہیں لائی ہوں؟"

"ہاں ہاں لائی ہو پورا گھر بھر گیا ہے۔"

"جہاں تک میرے ماں باپ کا ہاتھ پہنچا انھوں نے دیا وہ بے چارے کون سے لکھ پتی ہیں۔"

"ارے لکھ پتی نہیں ہیں جب بھی تمھیں اتنا ناز ہے؟ فقیرنی ہو کر منہ زوری کرتی ہو۔"

"میں کاہے کو ہوتی فقیرنی، آپ خود ہوں گی فقیرنی۔" نسیمہ نے بھی چستی دکھلائی جیسے کوئی تلوار کا وار تلوار پر ہی روک لے۔

"زبان سنبھال کر بات کرو تمھیں بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے۔" ذکیہ بھی چیخ گئی۔

"اپنی خبر تو لو، کیسے گلا پھاڑ رہی ہو دونوں کی دونوں۔"

"چپ بدتمیز، تیرے ماں باپ نے یہی تربیت دی ہے۔" زبیدہ بی بپھر کر بولیں۔

"اماں خاموش رہو، نیچ کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے" ذکیہ نے دخل اندازی کی۔

"میں کیوں ہوتی نیچ تم لوگ خود ہو نیچ"

زبیدہ بی کے پیچھے لگی اور اوپر بجھی "ہاں ہاں ہم تو نیچ ہی ہیں تو کاہے کو نیچ لوگوں میں آگئی؟"

"میں خود سے نہیں آئی ہوں، آپ لوگ ہی بیاہ کر لائے ہیں"

"اے ہے تو کیا ہم جانتے تھے کہ تو ایسی رذیل نکلے گی، بدزبان، زبان تو دیکھو ہر وقت کندھے پر پڑی رہتی ہے"

"پہلے اپنی زبانوں کی خبر لو پھر اوروں کو کہنا" نسیمہ آنکھیں نکال کر چیخی۔

"چل ہٹ موئی قطامہ، دور ہو نظروں سے" زبیدہ بی نے جھنجلاہٹ میں کواڑ بند کرنا چاہا تو کواڑ سیدھا نسیمہ کی پیشانی سے جا ٹکرایا۔

پھر کیا تھا گویا دشمن نے توپ سے وار کر دیا تھا۔ نسیمہ بلبلا گئی "ہائے میں مر گئی، میرا سر پھوڑ دیا" پھر اس نے اپنے سر پر دو ہتھڑ مار مار کر چیخنا چلّانا شروع کر دیا "ہائے میری قسمت پھوٹ گئی۔ نہ میری قسمت ایسی ہوتی اور نہ میں اس گھر میں آتی۔ اے اللہ میں کیا کروں؛ تو مجھے موت دے دے"

"اس کا دل گردہ تو دیکھو نٹنی کی طرح تماشے کر رہی ہے، کون اس کے منہ لگے۔ چل بیٹی اندر کمرے میں چل سجاد آجائے تو وہی اس سے نمٹے گا۔ آج جوتے نہ لگوائے ہوں تو کہنا"

پھر دونوں ماں بیٹی دالان میں آکر بیٹھ گئیں اور نسیمہ باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھی چیختی چلاتی رہی۔ جب تھک گئی تو اپنے کمرے میں آکر منہ سر لپیٹ کر پڑ گئی۔ پورا دن یوں ہی کٹ گیا رات کو سجاد دکان بند کر کے گھر آیا تو اس نے محسوس کیا گھر میں بڑی سنگین خاموشی چھائی ہوئی ہے ـــــ وہ سمجھ گیا کہ گھر میں آج پھر رن پڑا ہے۔ پورس کے ہاتھی سکندر کی فوجوں سے ٹکرا گئے ہیں۔ پھر بھی انجان بنتے ہوئے اُس نے ماں سے دریافت کیا "اماں کیا بات ہے۔ آج دوپہر کو میرا کھانا کیوں نہیں پہنچا؟"

"اپنی چہیتی سے پوچھو کھانا پکانے کی باری آج اسی کی تھی"

"تو کیا گھر میں کھانا نہیں پکا؟"

"نہیں... نہ کھانا پکا اور نہ کسی نے کھایا۔ میں بیمار صبح سے خود بھوکی ہوں۔"

سجّاد کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے روہانسی ہو کر جو کہا "میں صبح سے بھوکی ہوں" تو سجّاد کے اندر ایک شعلہ سا لپکا۔ اور وہ دھڑدھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا جہاں نسیمہ دوپٹہ تانے لیٹی تھی۔ سجّاد نے دوپٹہ پکڑ کر کھینچا اور ڈپٹ کر بولا "یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟ اُٹھ کر بیٹھو۔"

نسیمہ جو شاید جاگ رہی تھی اُٹھ کر بیٹھ گئی تو سجّاد دوبارہ مخاطب ہوا "کیا بات ہے کھانا کیوں نہیں پکایا؟"

"کوئی مجھے چین لینے دے تو کھانا بھی پکاؤں ایک ذرا سی دال کیا گر گئی ماں بیٹی دونوں نے میرا کلیجہ نوچنا شروع کر دیا۔"

"صرف دال کا بتلا رہی ہے۔" زبیدہ بی سجّاد سے مخاطب ہوئیں "ادھر آ بیٹا میں تجھے اس کے کرتوت دکھلاؤں۔" پھر انھوں نے سجّاد کا بازو پکڑا اور اسے باورچی خانے تک لے گئیں۔

"لے دیکھ سب کی سب پلیٹیں اُس نے توڑ ڈالیں تو میں کچھ نہ کہتی۔ گھر کی بربادی ہوتی رہے اور میں منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی رہوں؟ دیکھ دیکھ کر کلیجہ جلتا ہے۔ کچھ منہ سے نکالو اور وہ لڑنے کو تیار ہے۔ آج اُس نے ہمیں فقیر اور ننگے بھی بنا دیا۔" یہ کہتے کہتے بڑی بی رونے لگیں "محلّے میں ہماری کس قدر عزت ہے مجال ہے جو کوئی ہمیں کچھ کہہ سکے، مگر آج یہ دن بھی دیکھ لیا۔ دو ٹکے کی چھوکری ہمیں گالیاں دے رہی ہے۔ ہاں بیٹا اسی دن کو ہم نے تجھے پالا پوسا تھا کہ تیری جورو سے جوتیاں کھائیں، نہ ہوئے تیرے باپ۔ زندہ دفن کر دیتے۔ میں لاچار، بے بس گالیاں نہ سنوں تو اور کیا کروں۔" یہ کہتے کہتے زبیدہ بی پھوٹ کر رونے لگیں۔

سجّاد سراپا شعلہ بن گیا اُس نے غضبناک ہو کر بیوی کو آواز دی "اِدھر آؤ۔"

نسیمہ باورچی خانے میں پہنچی تو سجّاد نے نہایت ترشی سے سوال کیا "یہ پلیٹیں کیسے ٹوٹیں؟"

"میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑیں" نسیمہ نے ایک جھٹکے سے جواب دیا۔

سجاد کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ وہ چیخ کر بولا "یہ تو میں بھی جانتا ہوں برتن جان کر نہیں توڑے جاتے۔ پر میں پوچھ رہا ہوں یہ ٹوٹیں کیسے؟"

"دیوار گیر پر رکھی تھیں نیچے گر گئیں، کوئی میں نے پھینک دیں؟"

"تم نے نہیں پھینکیں تو وہ خود اُڑ کر نیچے آ گریں؟"

"ہمیں نہیں خبر کیا ہوا؟"

نسیمہ کا جواب سنتے ہی سجاد اور غضبناک ہو گیا "کمبخت پاجی کہیں کی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی۔"

نسیمہ چیخ کر بولی "خبردار جو مجھے گالی دی تو اچھا نہ ہوگا۔ رکھنا ہو تو عزت سے رکھیے میں گالی والی نہیں سننے کی۔ اس کمبخت روز روز کی جھک جھک سے عاجز آ گئی ہوں۔ ہر وقت کا تُکّا فضیحتا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

سجاد نے جو بیوی کے الفاظ سنے تو آپے سے باہر ہو گیا اور بولا "چلو بُرقع اوڑھو اپنی ماں کے گھر جاؤ یہاں تمھارا ٹھکانا نہیں ہے۔"

نسیمہ بھی تنکی بیٹھی تھی اُس نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی باندھی اور بُرقع سنبھال لیا جیسے مجرم کو جیل سے رہائی کا پروانہ مل گیا ہو۔

نسیمہ کے جانے کے بعد گھر میں سنّاٹا چھا گیا۔ سجاد صبح کام پر چلا جاتا اور یہ دونوں ماں بیٹی چولہا چکی میں لگ جاتیں۔ پھر خالی وقت آرام کرتیں اور ناول پڑھا کرتیں۔

کچھ روز تک تو ہر کام معمول کے مطابق ہوتا رہا اور سجاد میاں بھی ہشاش بشاش رہے لیکن پھر وہ کچھ بیزار بیزار سے نظر آنے لگے۔ رات کو دیر سے گھر آتے۔ ماں نے ٹوکا تو کہہ دیا — "آج کل کام زیادہ ہے۔"

لیکن آج تو سجاد نے کمال ہی کر دیا رات کافی جا چکی تھی اور سجاد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ زبیدہ بی بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہل رہی تھیں۔

دسترخوان پر کھانا رکھے رکھے کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بیٹے کے انتظار میں انھوں نے اب تک خود بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ انتظار کرتے کرتے ذکیہ بھی سو گئی تھی۔ اللہ اللہ کر کے دروازے

پر کھٹکا ہوا۔ زبیدہ بی تڑپ کر پہنچیں اور دروازہ کھولتے ہی وہ تیوریاں چڑھا کر بولیں۔ "یہ کون سا وقت ہے گھر پر آنے کا... ؟"

سجاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے صحن میں داخل ہوگیا۔

زبیدہ بی درشت لہجے میں دوبارہ بولیں "آخر یہ روز روز تمھاری تاخیر میں اضافہ کیوں ہوتا جا رہا ہے ؟"

سجاد جھلا کر بولا "گھر بھی آکر کیا کروں، کس سے بات کروں ؟"

خلافِ توقع اپنے حلیم الطبع بیٹے کی اونچی آواز سن کر زبیدہ بی ششدر رہ گئیں۔ سجاد ان کا نہایت ہی ادب اور احترام کرتا تھا۔ زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے تھے جب وہ بیٹے پر خفا ہوئی تھیں لیکن اُس نے اس طرح پہلے کبھی ترش روئی نہ دکھلائی تھی۔ وہ حیرانگی سے کچھ لمحے تک تو سجاد کا منہ تکتی رہیں۔ پھر انھوں نے اپنی نگاہیں نیچی کرتے ہوئے بہت ہی نرم لہجے میں کہا "چلو کھانا کھالو۔ اب مزید تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔"

سجاد جب کھانا کھانے بیٹھا تو اس نے ماں سے بھی کھانا کھانے کے لیے کہا۔ لیکن زبیدہ بی نے عذر کر دیا "نہیں میں نہیں کھاؤں گی میرا دل بھاری ہے۔"

سجاد نے متانت سے کہا "تو پھر میرا انتظار کیوں کر رہی تھیں۔ مجھ سے بھول ہوگئی مجھے اتنی تاخیر نہیں کرنا چاہیے تھی۔ معاف کر دیجیے۔ چلیے کھانا کھا لیجیے۔"

بیٹے کی اسی فرماں برداری پر تو وہ فدا تھیں۔ اُن کا دل بھر آیا اور بولیں "میرے چاندا! میں سب سمجھ رہی ہوں مگر کیا کروں۔ خدا نے پالا ہی ایسی چڑیل سے ڈال دیا ہے۔"

اس کے بعد سے سجاد نے گھر پر وقت سے آنا شروع کر دیا مگر زبیدہ بی دیکھ رہی تھیں کہ سجاد کی اُداسی بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ ہر طرح سے بیٹے کا دل لبھانے کی کوشش کرتیں لیکن اُسے خوش نہ کر پاتیں۔ وہ چُپ چُپ رہنے لگا۔ بہت کم بات کرتا۔ کھانا کھا کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا اور رات گئے تک کتابیں پڑھتا رہتا۔ زبیدہ بی دیکھتیں کہ سجاد کے کمرے کی بتی جل رہی ہے تو وہ دل ہی دل میں کڑھا کرتیں۔ جب تک سجاد بتی گل کر کے سو نہیں جاتا انھیں بھی چین نہیں آتا۔ وہ بھی جاگتی رہتیں اور وقفہ وقفہ سے دبے پاؤں جا کر بیٹے کے کمرے میں

جھانکتیں کہ شاید اب وہ سو گیا ہو اور بتی بجھانا بھول گیا ہو تو وہ بند کر دیں لیکن انھیں مایوسی ہی ہوتی۔ سجاد تو پچھلے پہر تک جاگتا رہتا تھا۔

آج پھر اسی طرح معمول کے مطابق زبیدہ بی نے کواڑ کی درز سے آنکھ لگائی اور اندر جو منظر نظر آیا اس نے انھیں چکرا کر رکھ دیا۔

سجاد کمرے میں کھونٹی کے پاس کھڑا ہوا تھا جہاں نسیمہ کے کچھ میلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ وہ آگے بڑھا اور اپنے چہرے کو ان کپڑوں پر رکھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کا تنفس تیز ہوتا چلا گیا اور اس کی آنکھیں بتدریج مُندتی چلی گئیں۔

ماجرا زبیدہ بی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ انھوں نے دو تین بار اپنی پلکیں جھپکائیں اور دوبارہ اپنی آنکھ کو درز کے مزید قریب کر دیا تاکہ معاملے کو سمجھ سکیں لیکن معاملہ جوں کا توں تھا۔

سجاد دیوار سے ٹیک لگائے بدستور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

زبیدہ بی نے چاہا کہ سجاد کو آواز دے کر معلوم کریں بیٹے خیر تو ہے۔ ابھی وہ لب کھولنے ہی جا رہی تھیں کہ ان کے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا اور انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

انھیں وہ دن یاد آئے جب ان کی شادی کو ابھی شاید ایک برس بھی نہیں گزرا تھا اور سجاد کے باپ کام کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے تو انھیں ان کی جدائی کے چھ مہینے کاٹنے دوبھر ہو گئے تھے۔ ایک دن وہ اپنے گھر کے میلے کپڑے دھوبی کو دے رہی تھیں کہ کپڑوں کی گنتی میں بھول ہو گئی۔ انھوں نے پچیس کپڑے گنے تھے اور دھوبی چوبیس کہتا تھا کہ ان کی ساس نے دخل در معقولات کی بولیں دلہن تکرار کی ضرورت نہیں ہے ایک ایک کر کے کپڑے دوبارہ گنتی کر لو۔ وہ جھکے جھکے فرش پر سے ایک ایک کپڑا اُٹھاتی تھیں اور الگ رکھتی جاتی تھیں ایک کپڑا جو لہرایا تو اس میں سے جانی پہچانی بڑی سرور انگیز باس آئی۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر اسے اپنی ناک سے لگا لیا۔

پھر گھبرا کر اپنے ارد گرد دیکھا کہ کہیں اُن کی اس بے وقوفی کو کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔ لیکن وہاں آس پاس کوئی تھا ہی نہیں۔ دھوبی سر کو جھکائے اپنی گٹھڑی باندھ رہا تھا۔ انھوں نے

نگاہ بھر کر اس کپڑے کو دیکھا تو وہ سجاد کے باپ کا میلا بنیان تھا اور ایک عجیب قسم کا کیف آور بھبکا اس میں سے نکل رہا تھا۔ انھوں نے کن انکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس بنیان کو فوراً ہی پلنگ کے نیچے پھینک دیا اور جب دھوبی چلا گیا تو انھوں نے اس کو پلنگ کے نیچے سے نکالا اور چپ چاپ اپنے صندوق میں رکھ آئیں پھر جب کبھی بھی ان کو پاگل پن ستاتا وہ اس بنیان کو صندوق سے نکال کر سونگھا کرتیں۔ اس میں سے اٹھتی ہوئی باس تیر کی طرح ان کے حواس کو دبوچ لیتی اور کیف و سرور سے ان کا انگ انگ ٹوٹنے لگتا۔ سانس کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ان کا نشہ بھی تیز ہوتا جاتا۔ اُن کی آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو کر اُبھر آتے اور وہ بے سُدھ ہو کر پلنگ پر گر جاتیں۔ پھر ساری ساری رات انھیں نیند نہیں آتی۔ زبیدہ بی سوچتی رہیں اور رات گزرتی رہی۔

پھر انھیں اپنا دل پگھلتا محسوس ہوا اور قہر و نفرت کی تنی ہوئی دیواروں پر مہر و محبت کے جذبے نے اپنی تیشہ گری کا ہنر آزمانا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے غم و غصّے کی تمام دیواریں منہدم ہوتی چلی گئیں۔

اب دور اُفق سے برداشت و تحمل کا نیا سورج جھانک رہا تھا۔ اس سورج کی کرنیں زبیدہ بی کے چہرے سے جیسے ہی ٹکرائیں اُن کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

پھر جوں ہی یہ روشنی ان کے ذہن کے تاریک دریچوں تک پہنچی۔ ممتا کی قندیل جگمگا اُٹھی اور ان کے چہرے پر سنہرا تبسم بکھرتا چلا گیا۔ وہ زیر لب بڑبڑائیں "نہیں میرے بچے تجھے اذیت میں مبتلا ہونے نہیں دوں گی۔ ابھی تیری شادی کو چھ سات ماہ ہی تو گزرے ہیں۔ یہی تو دن ہوتے ہیں آرزوؤں اور اُمنگوں کی سیرابی کے۔ ان ہی دنوں میں تو جذبات کے طوفان اُمڈا کرتے ہیں۔ اس پر روک لگانا سراسر ظلم و زیادتی ہے۔ برتن تو آتے جاتے رہیں گے لیکن یہ وقت لوٹ کر نہیں آئے گا" پھر انھوں نے ایک نیا عزم کیا۔

اور چشم تصور سے دیکھا تو نسیمہ سراپا بہار بنی پھولوں سے لدی ڈیوڑھی کی دہلیز پار کر کے صحن میں داخل ہو رہی تھی۔

آشنائی کا کرب

کویت ایئرویز کا ڈی سی ۱۰ طیارہ اب بادلوں کے پار نکل کر ہوا میں یکساں تیر رہا تھا۔ اس سے قبل بادلوں کے غول میں پھنس کر جہاز نے کافی جھٹکے کھائے تھے اور بہت دیر تک اوپر نیچے ہوتا رہا تھا جس کی وجہ سے کمزور دل مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ یوسف کمزور دل کا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی گھبرا گیا۔ جرکنگ کے وقت جب دل ڈوبتا ہے تو اچھے اچھے بوکھلا جاتے ہیں۔ وہ بھی گھبرا کر آیۃ الکرسی پڑھ رہا تھا کہ اس کے کان میں نقرئی گھنٹیاں بجیں "اینی تھنگ رونگ" اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا کویت ایئرویز کی انتہائی حسین ایئر ہوسٹس اس سے مخاطب تھی۔ بالوں کی ایک لٹ اپنے چہرے پر ڈالے وہ اپنے موتی جیسے دانتوں کی نمائش کرتی ہوئی بڑے دلآویز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ یوسف جو حسنِ یوسفی کی ایک مثال تھا اُس حُسن اور مردانگی کے بھرپور امتزاج کو اکثر لڑکیاں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں۔

ایئر ہوسٹس بھی گہری نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھی۔ یوسف کا دل دھڑکنے لگا۔ نہ جانے کیا بات تھی جب بھی کوئی لڑکی اسے گھورتی تو وہ کٹ کر رہ جاتا اس کا دل دھڑکنے لگتا اور شرم سے اُس کی نگاہیں خود بخود جھک جاتیں۔ اس وقت بھی گھبراہٹ میں اس کے منہ سے ڈھنگ کا جواب نہ نکل سکا۔ "نو تھینکس" کہتے ہوئے اس نے اپنی نظریں ایئر ہوسٹس کے چہرے سے ہٹالیں۔

تین سیٹوں کی رو میں جہاں وہ بیٹھا تھا دو سیٹیں خالی تھیں۔ ایئر ہوسٹس اس کے برابر کی سیٹ پر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ کچھ لمحوں کے سکوت کے بعد وہ پھر یوسف سے مخاطب

ہوئی "آر یو گوئنگ ہوم یور کنٹری از ویری پریٹی آئی لائک اٹ"

یوسف ایکدم جھنجلا۔ اس نے بُرا سامنہ بنایا۔ اس سے قبل کہ وہ ایئر ہوسٹس کو کوئی اُلٹا سیدھا جواب دے اسے روایتی رواداری کا خیال آیا تو اُس نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش میں اپنی باچھیں پھیلادیں اور اپنے سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولا

"یو آر ویلکم" اور اپنا منہ دوسری جانب پھیر کر کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔

یہ الٹرا موڈرن لڑکیاں دیوانی کیوں ہوتی ہیں۔ کویت میں جس آفس میں وہ کام کرتا تھا۔ وہاں بھی کچھ لڑکیاں کام کرتی تھیں ان میں مصری، فلسطینی، لبنانی اور فلپائنی تھیں ایک مہینہ وہاں جین سے گزرا تھا کہ انھوں نے ڈورے ڈالنا شروع کر دیے تھے۔ جولی اور کورنیلیا تو بالکل پاگل تھیں۔

ایک دن آفس میں سب کے سامنے الیکٹرو ٹائپسٹ جولی نے اُسے آنکھ ماری اور اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا تو وہ بوکھلا گیا۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ پھر بہت جلد مشہور ہوگیا کہ وہ لڑکیوں سے بدکتا ہے۔ ان کے خوف سے ٹفن ٹائم میں آفس میں اکیلا نہیں رُکتا۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ اس کے نیک کیریکٹر کے قائل ہوتے گئے۔ کچھ دوست بھی بن گئے اور کچھ تو بے تکلفی میں کافی آگے نکل گئے۔

مرد کی اوقات ہے جب وہ زیادہ بے تکلف ہوتا ہے تو جنسی باتیں ضرور کرتا ہے وہی حال یوسف کے ساتھ بھی ہوا۔ تب یوسف پر عقدہ کھُلا کہ ان میں سے کچھ لڑکیاں دھندہ بھی کرتی ہیں۔ اس دن جولی نے اس کو مذاق میں آنکھ نہیں ماری تھی بلکہ مقصد اس کو رجھانا تھا۔

ایک دن شام کو آفس کی چھٹی کے بعد جیک نے پروگرام بنایا کہ آج رات کا کھانا چائنیز میں کھایا جائے۔ جیک امریکن تھا اور یوسف جانتا تھا کہ امریکن بہت شاہ خرچ ہوتے ہیں۔

یُوسف نے خرچ کے ڈر سے بہانا بنایا تو جیک ہنس دیا اور بولا "یار بڑے کنجوس ہو، خرچ سے ڈرتے ہو۔ دعوت تو میری جانب سے رہے گی۔ تمھارا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔ بس تم ساتھ چلو مجھے تمھیں میناد کھلانا ہے۔"

یوسف نے اپنے چہرے پہ ایک پھیکی سی مُسکراہٹ لاتے ہوئے رضامندی کے اظہار میں گردن ہلادی۔

ہوٹل سے فارغ ہونے کے بعد جیک نے ٹیکسی پکڑی اور کورنیلیا کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ کورنیلیا ایک گڑیا سی حسین فلپائنی لڑکی تھی۔ اس کا فلیٹ بھی بڑا خوبصورت تھا۔ اُس نے مسکرا کر دونوں کا خیر مقدم کیا اور سٹنگ روم میں لے آئی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہسکی کی بوتل کھول لی گئی۔ جیک اور کورنیلیا شغل میں مصروف ہو گئے۔ یوسف ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔

اچانک نشے میں دھت کورنیلیا اس کے پاس آئی اور اس کے اوپر لد گئی۔ وہ اس طرح اُچھلا گویا کسی نے سانپوں بھرا پٹارہ اس کے اوپر اُلٹ دیا ہو۔

یوسف کے بدحواس ہو کر اُچھلنے سے کورنیلیا ایک جانب لڑھک گئی۔

یہ دیکھ کر جیک نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

کورنیلیا بُرے بُرے منہ بناتی ہوئی اٹھی اور دوبارہ یوسف سے لپٹ گئی۔ تیز قسم کی پرفیوم اور وہسکی کی ملی جُلی بُو کا بھبکا یوسف کے حواس سے ٹکرایا۔ اس سے قبل کہ کورنیلیا کے گداز جسم کے لمس سے اس کے جذبات میں تحریک پیدا ہو اس نے متنفر ہو کر کورنیلیا کو دھکا دیا تو کورنیلیا دوبارہ صوفے پر گری ہوئی خوں خوار نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ پھر وہ نشے میں اول فول بکنے لگی۔

جیک جو سامنے بیٹھا ہوا ہنس رہا تھا اس نے کورنیلیا کو سنبھالا اور یُوسف سے بولا "تم یہیں صوفے پر سو جاؤ۔ ہم صبح واپس چلیں گے۔" پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ کورنیلیا کی کمر کے گرد حمائل کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے یوسف کو بائی کا اشارہ کیا اور کورنیلیا کو لیے ہوئے بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔

یوسف انھیں سوچوں میں گم تھا کہ اسی ایئر ہوسٹس کی آواز آئی " ڈِڈ یو مائنڈ "
" اوہ نو " یوسف نے ایک بار پھر اخلاقاً دانت نکال دیے۔
ایئر ہوسٹس تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اب طیارے نے بغیر کسی حرکت کے ہوا میں تیرنا شروع کر دیا تھا۔ یوسف نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ سامنے جہاز کا بڑا سا ونگ تھا جس پر کویت ایئر ویز کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ ونگ سے نیچے کافی گہرائی میں بادلوں کے سفید غول دھوپ میں یوں چمک رہے تھے جیسے کسی نے چاندی کی فصل کاٹ کر کھیتوں میں جگہ جگہ ڈھیریاں بنا رکھی ہوں۔ یوسف کا اعصابی تناؤ جو خوف اور جھنجلاہٹ کے سبب سے پیدا ہو گیا تھا ختم ہو گیا۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ سوچنے لگا۔ آن کی آن میں یہاں کایا پلٹ گئی کچھ دیر قبل بادل ہمارے اوپر اوپر اُڑ رہے تھے اور اب ہم خود بادلوں کے اوپر تیر رہے ہیں۔ منظر بالکل اُلٹ گیا ہے، ان بادلوں سے ابھی ہم جتنی دور ہیں غالباً زمین بھی ان سے اتنی ہی دور ہوگی۔ زمین کا خیال آتے ہی اس کو گھر یاد آیا، امّاں یاد آگئیں۔

امّاں بی اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔ انھیں خبر بھی نہیں ہے کہ میں واپس ان کے پاس آرہا ہوں جب اچانک وہ مجھے دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ہو سکتا ہے مجھے اچانک سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے رونے لگیں کیوں کہ انھیں کسی چیز کی برداشت تو ہے نہیں خوشی ہو یا غم، ان کا آنسوؤں پر ہی بس چلتا ہے۔ ابا کا انتقال ہوا تو میں تین سال کا تھا سلائی کڑھائی کر کے انھوں نے مجھے پالا پوسا لکھایا پڑھایا۔ " بی کام " اور پھر " سی اے " کرنے کے بعد جب مجھے نوکری نہیں مل رہی تھی تو کس قدر رو رو کر وہ میرے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں

انھوں نے تمام زندگی کبھی کسی رشتے دار کے سامنے اپنا ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دی لیکن میری ملازمت کی خاطر انھوں نے اپنی خودداری کو بھلا کر اپنے رشتے کے بھائی سعید ماموں کی خوشامد کی تو سعید ماموں نے میرا اقامہ بنوایا، ٹکٹ کے پیسے دیے۔
اور کویت میں اپنے جنرل اسٹور کے لیے سیلزمین کم اکاؤنٹینٹ کی ملازمت پکی کر دی
یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ سعید ماموں کا بھی اس میں فائدہ تھا۔ بھلا صرف نوّے دینار میں

اکاؤنٹینٹ اور سیلزمین دونوں کام کرنے والا انھیں کہاں مل سکتا تھا۔ اس کے لیے تو کسی ہندوستانی رشتے دار کو ہی بیوقوف بنایا جاسکتا ہے۔ اب جب کہ دو سال بعد میں نے استعفیٰ پیش کیا تو وہی ماموں جو بڑی بڑی خوشامد اور منت سماجت کے بعد مجھے ملازم رکھنے پر راضی ہوئے تھے، میرے استعفیٰ کا سن کر چراغ پا ہوگئے۔

اماں بی نے ہاتھ پاؤں جوڑے، گڑگڑائیں تو بہت مشکل سے میرا پیچھا چھوٹا اور امریکن فرم سن شائن انجینئرنگ میں مجھے پورے دو سو دینار کی ملازمت مل گئی۔ جس کے ہندوستان میں تقریباً تیس ہزار روپے بنیں گے اور پھر ہر دو سال بعد ترقی بھی ملے گی۔

یوسف اسی استغراق میں گم تھا کہ جہاز میں اعلان ہوا۔ بہت جلد ہم دہلی کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں۔ مسافروں سے گذارش ہے کہ وہ اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیں۔

وطن کی سرزمین کا اعلان سنتے ہی یوسف کو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی اماں بی سے ملاقات کے تصور سے اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اب جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ اس پہ بھاری ہونے لگا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے وقت کاٹا اور امیگریشن وکسٹم کے مراحل طے کرتا ہوا وہ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آیا اور جب وہ اچانک گھر میں داخل ہوا تو نور جہاں عُرف نورن بُوا صحن میں جھاڑو دے رہی تھیں۔ اپنے جگر گوشے کو اچانک انھوں نے سامنے کھڑا دیکھا تو جھاڑو ان کے ہاتھ سے یوں نکل گیا۔ جیسے کرنٹ نے جھٹکا مارا ہو۔ وہ ہکا بکا اپنے منہ پہ انگلیوں کے پورے رکھے حیرت کی تصویر بنی یوسف کا چہرہ اس طرح تکنے لگیں۔ جیسے ان کے سامنے دنیا کا آٹھواں عجوبہ آگیا ہو۔

یوسف جس نے ان چار برسوں میں خاصہ رنگ نکال لیا تھا اپنے چہرے پہ نکھار لیے سوٹ ٹائی میں ملبوس سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہنس کر بولا "کیا ہوا اماں بی ...؟ کیا دیکھ رہی ہیں؟ یہ میں ہی ہوں آپ کا یوسف"۔

اب دریائے حیرت جو شدتِ استعجاب سے تھم گیا تھا، حرکت میں آیا اور اس کی موجوں نے اُمنڈ کر اپنے جگر پارے کو اپنے آپ میں سمو لیا۔

شدتِ جذبات سے ممتا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بیٹے کو گلے لگائے رُندھی ہوئی آواز

میں پوچھ رہی تھیں "میرے چاند! تم اچانک کیسے آگئے۔ اپنے آنے کی خبر تو کی ہوتی؟"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے محلّے میں یوسف کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ نورن بُوا جن کی سماج میں کوئی خاص وقعت نہیں تھی، اب گھر گھر ان کا چرچہ ہونے لگا۔ ان کی ہمت کی داد دی جانے لگی کہ انھوں نے محنت و مشقت کر کے اپنے بیٹے کو ایسا سنوارا کہ آج کویت میں ملازمت کر رہا ہے۔ کویت جو خوابوں کا جزیرہ ہے جہاں جانے کے لیے ہزاروں لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں۔

اب نُورن بُوا جہاں جاتیں لوگ عزّت سے پیش آتے، خاطر تواضع کرتے۔ دور کے رشتے دار نزدیک آگئے اور قریب کے اعزّہ تو انھیں اپنی فیملی کا فرد سمجھنے لگے۔ اُنھیں اب معلوم ہوا کہ ان کا کُنبہ کتنا وسیع ہے۔ جس کسی کی بھی لڑکی جوان تھی وہ ان کے کنبے کا نکل آیا۔ لوگ اشاروں کنایوں میں خود اپنی بیٹی کی بابت اظہار کرنے لگے تو ایک دن اماں بی نے یوسف سے کہا۔

"بیٹا! اللہ کی رحمت سے برسرِ روزگار تو تم ہو گئے ہو اب خیر سے گھر بسانے کی بھی سوچو۔ میں نے کئی لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں تم کسی کو پسند کر لو تو پیغام ڈال دوں۔"

ماں کی بات سُن کر یوسف نے قہقہہ لگایا اور بولا "اماں بی ایسا غضب بھی نہ کرنا اگر لڑکی چالاک نکلی اور اس نے مجھے اپنے قبضے میں لے لیا تو تمھارا کیا ہوگا؟"

نُورن بُوا مصنوعی غصّے سے بولیں "تو کیا اس ڈر سے میں تمام عمر تمھاری شادی نہیں کروں گی؟"

یُوسف نے شرارت سے جواب دیا "نہیں اماں بی شادی ہوگی اور ضرور ہوگی پر مجھے ذرا بڑا تو ہو جانے دیجیے، کچھ سمجھ تو آجائے۔"

"بڑا ہو جانے دوں" اماں بی نے آنکھیں نکالیں "کب شادی کرو گے؟ جب سر کی مُنڈیروں پر دھوپ آجائے گی تب؟"

"اب ایسا بھی نہیں۔ بس کچھ دن اور انتظار کر لیجیے۔"

"کیا خاک انتظار کر لوں؟ تم کیا سمجھتے ہو میں دو ایک سال میں مر جاؤں گی تو میرے بعد پیاہ رچا کر چین سے رہو گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ . . . نہیں امّاں بی میں یہ سب نہیں سوچتا" یوسف جذباتی ہوگیا۔

"تو پھر شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟ تم جس کو بھی پسند کروگے اس لڑکی سے ہی تمھاری شادی کردوں گی۔ تم اس بات سے مت گھبراؤ کہ میں اپنی مرضی تمھارے سر تھوپ دوں گی۔" پھر نورن بُوا بڑے دُلار سے بولیں "بیٹے . . . تم نہیں جانتے کہ ماں اپنی اولاد کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھتی ہے۔ اللہ اللہ کر کے تمھیں پالا پوسا ہے۔ اب جب کہ خدا نے ہمارے بُرے دن پھیر دیے ہیں تو پھر میری ایک ہی آرزو رہ گئی ہے کہ اپنے چاند کو دولہا بنا دیکھ لوں۔"

ماں کی بات ٹالنا یوسف نے نہیں سیکھا تھا۔ اس نے ہاتھ پیر ڈال دیے۔ تو پھر حیلے بہانے سے شہر بھر کی لڑکیاں بلائی جانے لگیں۔ لڑکیوں کے ریوڑ کے ریوڑ دیکھے گئے اور کافی چھان پھٹک کے بعد ایک حور شمائل ماں بیٹے دونوں کو پسند آگئی۔ منگنی ہوئی اور شادی بھی ہوگئی۔

شادی کو ایک مہینہ گزرا۔ دوسرا بھی ختم پر آگیا تو نورن بُوا کی جہاندیدہ آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ انھوں نے بڑے پیار سے بیٹے کو پکارا "یوسف . . . بیٹے میں تو کہوں تم ساری عمر میری آنکھوں کے سامنے ہی رہو۔ پر بیٹا مرد ذات کو روزی روٹی کے لیے باہر نکلنا ہی پڑتا ہے۔ تم کو یہاں آئے ہوئے تین مہینے ہونے جا رہے ہیں۔ تمھاری نوکری پر حرف تو نہیں آنے کا؟"

یُوسف میاں بھی سب کچھ سمجھ رہے تھے اور دل ہی دل میں ڈر بھی رہے تھے کہ زیادہ دیر ہونے سے کہیں ملازمت نہ چلی جائے۔ چھٹّی کی مدّت جو دو ماہ کی تھی پوری ہو چکی تھی۔ مزید ایک ماہ کے لیے انھوں نے درخواست بھیج دی تھی اس کا بھی وقت ختم ہونے جا رہا تھا پر اس کو کیا کرتے کہ انھوں نے نئی نئی چڑھائی تھی اس کا پورا نشہ سر پر چڑھا ہوا تھا۔ خمار اور کچھ اور کی پکار کیے ہوئے تھا تو وہ کیسے ساغر بدست ساقی سے منہ موڑ لیتے۔ سرشاری میں تو انسان تلچھٹ تک پی جاتا ہے۔

امّاں بی کی بات سن کر وہ کچھ شرمندہ ہوگئے جیسے ان کی چوری پکڑلی گئی ہو۔ سر جھکا کر متانت سے بولے "ہاں امّاں بی میں آج ہی جا کر اپنے لیے سیٹ بُک کروالوں گا اور اسی ہفتے جانے کی

کوشش کروں گا۔"

نورن بوا نے جواب سنا تو بیٹے کی مجبوری اور سعادت مندی دیکھ کر ان کا دل بھر آیا۔ وہ دوپٹے کے کونے سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی دوسری جانب مڑ گئیں۔

بہر حال یوسف میاں کویت پہنچے تو وہی خوبصورت شہر کویت تھا۔ صاف شفاف کشادہ سڑکیں۔ بلند عمارتیں، کہیں کھجور کے درخت تو کہیں فوارے، وضع وضع کے رنگین نیون سائن مرکری لائٹیں، ہر چیز میں ہم آہنگی، ایک کشش لیکن یوسف میاں کو اب ہر شے بے وقعت اور بے کشش لگ رہی تھی کیوں کہ اب وہ ایک نئے درد سے آشنا ہو گئے تھے جس کی دوا وہ ہندوستان میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ اب وہ تھے اور دن رات کی ایک کسک۔ یہ کسک زیادہ بڑھی تو ان کا چہرہ کمہلا گیا، بھوک ختم ہو گئی۔ تین مہینے میں ہی وہ پریشان ہو گئے۔ جب ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی تو انھوں نے جیک سے تذکرہ کیا۔

"یار جیک یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں بدلتا جا رہا ہوں۔ میری نگاہ کی شرم ختم ہوتی جا رہی ہے بھوکی نظروں سے میں ہر آتی جاتی لڑکی کو گھورتا رہتا ہوں۔"

جیک نے حسب معمول قہقہہ لگایا اور بولا "زیادہ پارسائی کا نتیجہ ہے۔"

یوسف نے برا مانا "پارسائی... تم امریکن ہو، کہہ سکتے ہو۔ مگر پارسا تو میں ہمیشہ سے تھا اور اب بھی ہوں۔"

جیک یوسف کی جانب دیکھ کر تضحیک آمیز انداز میں مسکرایا۔ پھر وہ اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولا "میری جان پہلے تمھارا جسم لذت آشنا نہیں تھا اسی لیے تم پارسا بھی تھے اور نیک بھی۔ اب جب کہ تم خمار و مستی کے کوچوں میں داخل ہو کر حلاوتوں کی نیرنگی سے فیضان حاصل کر چکے ہو تو اب طبیعت تو بار بار ان گلیوں کے چکر لگانے کے لیے مچلے گی ہی۔ تم ایک دم ان راہوں کو کیسے بھلا دو گے۔ میں تو کہتا ہوں اب تم ان راستوں کو بھلا ہی نہ سکو گے۔ فطرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اس کو کہاں لے جاؤ گے؟ خیر کوئی بات نہیں۔ آج جمعرات ہے آفس کی چھٹی جلد ہو جائے گی شام کو میں تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔"

دفتر کی چھٹی ہوتے ہی جیک نے یوسف سے کہا "ڈاکٹر کے پاس بھی تو جانا ہے۔ جلدی تیار

ہو جاؤ۔ کھانا بھی باہر ہی کھالیں گے۔"

بھلا یوسف کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا جب کہ ہوٹلوں کا بِل ہمیشہ جیک ہی دیا کرتا تھا۔
کچھ ہی دیر میں دونوں نے ٹیکسی پکڑ لی اور روانہ ہو گئے۔

یہ ایک دس منزلہ عمارت تھی، اس کی ساتویں منزل پر دونوں لفٹ سے پہنچے۔ ایک فلیٹ کے سامنے رُک کر جیک نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ دروازہ کھُلا تو سامنے جولی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

جولی جو اُن کے ساتھ ہی آفس میں کام کرتی تھی۔ جیک نے کہا آؤ اندر چلیں۔

یوسف کی سمجھ میں ماجرا نہیں آیا۔ چلے تھے ڈاکٹر کو دکھلانے اور یہ سرپھرا کہاں لے آیا۔

جیک نے یوسف کی آنکھوں میں الجھن کے آثار دیکھ کر ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ اپنے سر کو اثبات میں دو تین بار جنبش دی اور یوسف کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا "اندر تو چلو جولی کو بھی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ چلیں گے وہاں بھی چلیں گے۔" پھر وہ یوسف کا ہاتھ پکڑے ہوئے سیدھا اسے سٹنگ روم میں لے آیا جہاں بہت خوبصورت دبیز قالین فرش کیا ہوا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں چار کورڈ لیمپ جل رہے تھے جن سے اِن ڈائریکٹ نکلتی ہوئی مدھم مدھم روشنی آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔

جیک ایک صوفے میں دھنس گیا۔ اس نے یوسف کو بھی بیٹھنے کے لیے ایک صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

جُولی نے مسکرا کر پوچھا "سوفٹ یا ہارڈ ابھی کیا چلے گا؟"

"ہمیں بھوک لگی ہے باقی جو تم چاہو۔" جیک کا جواب تھا

جُولی نے گردن ہلائی اور دوسرے کمرے میں مُڑ گئی۔

جُولی جلد ہی ناشتے کی ٹرے دھکیلتی ہوئی واپس آئی تو وہ نہایت ہلکا اور باریک گاؤن نما لبادہ زیبِ تن کیے ہوئے تھی۔ جس کے اندر سے جھکتے ہوئے چاند یوسف کے جذبات کے سمندر میں تلاطم پیدا کرنے لگے۔ اُس کا تنفس تیز ہونے لگا اور وہ بار بار اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ پھر اس نے جیک کو مخاطب کیا "ڈاکٹر کو دکھلانے کا کیا ہوا؟"

جیک نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا پھر جُولی سے مخاطب ہو کر بولا "جُولی! خیال رہے انھیں آج ہی ڈاکٹر کو دکھلانا ہے۔"

جُولی نے سوالیہ نظروں سے جیک کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا "اور آپ...؟"

"میری فکر نہ کرو میں ٹھیک ہوں۔ میں اگلے سنڈے کو پھر آؤں گا۔"

جُولی نے اپنے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا "جیسی آپ کی مرضی۔" پھر اس نے وہسکی کی بوتل کھول لی۔ جیک نے شغل شروع کر دیا۔ یوسف کی جانب بھی جُولی نے بوتل بڑھائی مگر یوسف نے سختی سے منع کر دیا۔

جیک نے جُولی کی جانب دیکھ کر اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ جیسے کہہ رہا ہو سب ٹھیک ہے رہنے دو۔ پھر مسکرا کر اپنے گلاس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کچھ ہی لمحے گذرے ہوں گے کہ جیک اچانک اُٹھا اور اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر بتیاں آف کرنا شروع کر دیں۔ اب رنگین ٹی وی سے نکلتے ہوئے قوس و قزح کے رنگ اندھیرے میں مرتعش ہو رہے تھے جس کی مدھم مدھم روشنی ماحول کو نیم روشن کیے ہوئے تھی۔

یوسف ٹی وی میں الجھا ہوا تھا۔ الفریڈ ہچکاک کی فلم سائیکو چل رہی تھی۔

اس نے اچانک تیز قسم کی پرفیوم کی بُو محسوس کی۔ ساتھ ہی اس کو ایک نرم و گداز جسم کی قربت کا احساس ہوا۔ یوسف نے اپنی بائیں جانب کن انکھیوں سے دیکھا، جُولی اس سے چپکی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ کسمسایا اور داہنی جانب کھسک کر پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دو چار پل ہی گذرے ہوں گے کہ قربت اور نزدیک آگئی۔ اب مزید داہنے کھسکنے کی گنجائش بھی نہیں تھی کیوں کہ یوسف صوفے کے ہتھے سے تو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ خاموش بیٹھا تاؤ کھاتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس گرم گرم لمس کے لطیف احساس سے یوسف کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ اس نے بے بسی سے جیک کی جانب دیکھا تو جیک ہاتھ میں بوتل تھامے کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

جُولی کے جسم کا دباؤ اس کے جسم پر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر جُولی کو اپنے آپ سے دور کرنے کے لیے آہستہ سے اُسے دھکیلا تو اُسے احساس ہوا کہ جُولی کے بدن کا کچھ حصہ اس

حصّہ کھُلا ہوا بھی ہے۔ نادانستگی میں اُس کا ہاتھ جُولی کے جسم کے گداز حصّے سے جا ٹکرایا۔

جُولی نے کچھ اور سمجھا۔ جواب میں اس نے اپنی باہیں یوسف کی گردن میں حمائل کر دیں۔ اتفاق کے تصادم سے یوسف کے پورے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ دماغ پر خون کی دھمک محسوس ہوتے ہی اس کی باہیں خودکار طور پر جولی کے گرد لپٹ گئیں۔

جُولی نے یوسف کی گرفت سے اپنے آپ کو آہستگی سے آزاد کیا۔ پھر یوسف کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر اُسے صوفے سے اُٹھایا اور اسے اپنے ہمراہ لیے ہوئے بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔

دوسری صبح جیک سٹنگ روم کے قالین پر پڑا ہوا سو رہا تھا کہ جُولی نے آکر اسے جھنجوڑ دیا
"کس پاگل کو میرے ساتھ کر دیا ہے وہ رو رہا ہے۔"

جیک نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا "روئے گا، کچھ دیر رونے دو، پھر خود ہی چپ ہو جائے گا۔ آج اس کی تپسیا جو ٹوٹ گئی ہے۔"

جُولی غرّا کر بولی "مگر مجھے کوفت ہو رہی ہے۔ صبح صبح میرا موڈ برباد کر دیا۔ مجھے اپنی بے عزّتی کا احساس ہو رہا ہے۔ تم اُسے چپ کراؤ ورنہ میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔"

جیک قالین سے اُٹھتے ہوئے بولا "صبر کرو میری جان" پھر وہ جُولی کا ہاتھ تھامتا ہوا بولا "آؤ میرے ساتھ۔"

جیک جب بیڈروم میں پہنچا تو دیکھا یوسف یوں گم صُم اور اُداس بیٹھا ہے۔ جیسے کسی بوڑھے کے پاس پردیس سے اس کی جوان اولاد کے مرنے کی خبر آئی ہو، یا کسی بزنس مین نے نے اپنے مال بھرے جہاز کے ڈوبنے کی خبر سُن لی ہو۔

جیک یوسف کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر زور سے ہنسا اور بولا "صبح بخیر میرے دوست آج بہت جلد بیدار ہو گئے۔ کہو رات نیند کیسی آئی۔ بستر آرام دہ تھا یا نہیں؟"

یوسف خالی خالی نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا منہ سے کچھ نہیں بولا۔

دو ہفتے تک یوسف نارمل رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ کام سے اُس کا جی اُچاٹ ہونے لگا اور جب اس کے اندر اُٹھتی ہوئی تیخیر بگولے بن کر اس کے

دماغ میں ناچنے لگی تب پھر اسے تبرید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کی نگاہیں خود بخود جیک کو تلاش کرنے لگیں کیونکہ اب جیک ہی اس کا دوست اور غم گسار تھا۔

جیک نے سب کچھ سنا اور بولا" جانتے ہو اس رات جولی نے مجھ سے وہسکی کے علاوہ کتنے کا حساب کیا تھا؟"

یوسف نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

تو جیک مسکرا کر بولا" پورے پچاس دینار کا، وہ میں نے تمہاری دوستی کی خاطر دے دیئے۔ اب اپنا علاج تم خود کرو۔" یکایک جیک کی نظر سامنے سے جاتی ہوئی کورنیلیا پر پڑی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلایا۔ وہ قریب آئی تو جیک بولا" آج رات یوسف تمھارے مہمان رہیں گے۔"

کورنیلیا کے لبوں پر تبسم پھیل گیا" ضرور ضرور، کتنے بجے تک آئیے گا؟"

"بس کام ختم کر کے پہنچ جائیں گے۔" جیک کا جواب تھا۔

دوسرے روز صبح کورنیلیا نے جب یوسف سے ساٹھ دینار طلب کیے تو یوسف کا تو دم ہی نکل گیا۔ اس کی تنخواہ ہی دو سو دینار تھی۔ کورنیلیا نے یوسف کی آنکھوں میں پس و پیش کی الجھن کو محسوس کرتے ہوئے کہا" تم ہمارے بہت اچھے دوست ہو، ایسا کرو تم صرف پچاس دینار دے دو۔ کھانے پینے وہسکی وغیرہ کے اخراجات میرے ذمے رہیں گے اور پھر ویسے بھی تم نے وہسکی پی کہاں ہے؟"

یوسف کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی، اس نے توبہ کی اور چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

توبہ کے بعد یوسف کی خودارادیت جاگ گئی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ نت نئے جسموں کی آشنائی نے اس کی پیاس بھڑکا دی تھی۔ جولی اور کورنیلیا کے اشارے مزید جلتی پر تیل کا کام کرتے اور وہ کسی تشنہ کام مسافر کی طرح بہتے دریا سے دور کھڑا اس دلدل کو حسرت سے تکتا رہتا جو دریا کے کنارے کنارے میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

جیسے تیسے کر کے اس نے تین ماہ گزارے اور اب پھر اس کے سر پر وہی بھوت سوار

ہوگیا تو اس نے جنک سے دریافت کیا " آخر یہاں اور دوسرے لوگ کس طرح گزارہ کرتے ہیں ؟ "

جنیک نے جواب دیا " کچھ تمھاری طرح کچھ تم سے مختلف کیوں کہ سب کے حالات یکساں نہیں ہوتے۔ تم ایک کام کرو، سری لنکن یا کسی انڈین گرل کو تلاش کرو وہ سستی ہوگی پندرہ بیس دینار میں پٹ جائے گی۔ یہاں قحبہ خانے نہیں ہیں کہ سستے چھوٹ جاؤ، قحبگی یہاں قانوناً جرم ہے۔ پرائیویٹ اور خفیہ طور پر تسکینِ دل کا کچھ سامان یہاں ہو جاتا ہے۔ ایسے میں قیمت کا زیادہ ہونا تو لازمی ہے۔ اگر تم اپنی بیوی کو یہاں بلاؤ گے تب بھی تم پر کافی بوجھ پڑ جائے گا کیوں کہ کھانے پینے سے زیادہ رہائش مہنگی ہے۔ ابھی تو تم مل جل کر رہتے ہو، بیوی کو بلانے کے بعد تمھیں لازمی طور پر فلیٹ لینا پڑے گا" پھر وہ مسکرا کر بولا " احمق برداشت کرو برداشت اور پھر تم مسلمان بھی تو ہو۔"

روتے پیٹتے کسی نہ کسی طرح سال پورا کرنے کے بعد یوسف اپنے مینیجر کے کمرے میں بیٹھا ہوا اس سے کہہ رہا تھا " سر! مجھے ایک ماہ کی چھٹی چاہیے۔"

مینیجر نے اس کا فائل نکلوایا اور بولا " ناممکن، تمھیں گھر سے آئے ہوئے ابھی ایک سال گزرا ہے۔ قانوناً دو سال سے قبل کسی کی چھٹی منظور نہیں ہو سکتی۔"

یوسف نے نہایت، جذباتی انداز میں جواب دیا " سر میں بیمار ہوں۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ آپ کو ہر حالت میں میری رخصت منظور کرنا ہوگی ورنہ مجھے اپنا استعفیٰ پیش کرنا پڑ جائے گا۔"

مینیجر حیرت سے اسے تکنے لگا " سن شائن انجینئرنگ " سے استعفیٰ ؟ جو کویت میں سب سے اچھی تنخواہ دیتا ہے، اس فرم میں ملازمت ملنا معمولی بات نہیں تھی۔ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی اور وہ سختی سے بولا " لڑکے ہوش کی دوا کرو، تم اپنا کام بینڈ رنگ چھوڑ کر نہیں جا سکتے اور پھر تمھارا کنٹریکٹ بھی دو برس کا ہے جو تمھیں پورا کرنا ہوگا، اور تم بیمار تو ہرگز نظر نہیں آتے تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

" سر میں قطعی جھوٹ نہیں بول رہا، میں سچ مچ بیمار ہوں۔"

"سچ یا جھوٹ میں نہیں جانتا ابھی تمھاری چھٹی میں ایک سال کی دیر ہے۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے مینجر نے اس کا فائل اٹھا کر بند کر کے دوسرے کنارے پر ڈال دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

یوسف کچھ دیر وہاں کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا پھر پیر پٹختا ہوا مینجر کے روم سے نکل گیا۔

یوسف اب روز بروز چڑ چڑا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ یوسف جس کی خوش دلی مشہور تھی، جو ہر کس و ناکس سے مسکرا کر بات کرتا تھا اب آفس میں بات بے بات اُلجھ جاتا۔ کبھی کبھی تلخی بھی ہو جاتی تو جیک یہ کہہ کر بات ختم کرا دیتا "یار جانے بھی دو اپنا یوسف آج کل ٹینشن کا شکار ہے ہم سب جانتے ہیں وہ دل کا بُرا نہیں ہے۔ بس حالات کی بنا پر ذرا تیخ ہو گیا ہے۔ چھوڑو معاف کرو" اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

آج کئی روز سے یوسف پر کچھ زیادہ ہی اضمحلال طاری تھا۔ اس کو کئی راتوں سے نیند نہیں آ رہی تھی جب کہ وہ نیند لانے کی دوائیں بھی استعمال کر رہا تھا۔ وہ اپنی ٹیبل پر جھکا ہوا کام میں مصروف تھا کہ کسی کام سے جولی اس کے پاس آئی تو وہ کچھ زیادہ ہی کھلے گریبان کا شرٹ نما بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔

بات کرتے کرتے جولی جان بوجھ کر یوسف کی میز کے قریب ہو کر کچھ زیادہ ہی جھک گئی یوسف کی نظریں جولی کے گریبان کی طرف گئیں تو وہیں اٹک کر رہ گئیں۔ کچھ لمحوں تک تو وہ روشندان سے اُمنڈتے ہوئے بگولوں کو بے اختیار ہو کر یوں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے کسی ندیدے بچے کو نالی میں گری ہوئی چاکلیٹ نظر آ جائے۔ پھر اچانک گھبرا کر اس نے اپنی گردن گھمائی اور اپنی نظریں میز پر رکھے رجسٹر پر جماتے ہوئے جولی کو اکاؤنٹ کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے لگا۔

جولی جو یوسف کی اضطرابی کیفیت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی اور جواب میں مسکراتے ہوئے فحش انداز میں آنکھ ماری۔

یوسف اب تک اپنے ذہن پر قابو پا چکا تھا، ڈپٹ کر بولا "سیدھی کھڑی رہو۔"
جواب میں جولی نے اپنی آنکھوں میں خمار پیدا کرتے ہوئے یوسف کی آنکھوں میں جھانکا

اور مخصوص ترغیبی انداز میں زبان باہر نکال کر اپنے اوپری ہونٹ کو چاٹنے لگی۔

یوسف چراغ پا ہو گیا اور درشت لہجے میں بولا "میں کہتا ہوں سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔"

جولی کو یوسف کے لہجے میں اپنی بے عزتی کا احساس ہوا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی کھڑی ہو گئی اور چیخ کر بولی "کچھ پارسا ہو گئے ہو یا جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو ویسے ہی کہو اکڑتے کیوں ہو؟"

جولی کے الفاظ سن کر یوسف آپے سے باہر ہو گیا۔ جنون میں اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک فحش گالی نکلی۔ پھر وہ زور سے چیخا "میں کہتا ہوں جاؤ... یہاں سے چلی جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیا اچھا نہیں ہوگا؟ تم کیا کر لو گے؟ تمھاری حقیقت ہی کیا ہے ایک مفلس، کنگال جو پاگل ہو گیا ہے۔"

اب یوسف ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ اس کے منہ سے عجیب خوفناک سی آواز نکلی، جو کسی طرح بھی کسی انسان کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔ "میں کنگال ہوں، پاگل ہو گیا ہوں۔" یہ کہتے کہتے اُس نے اپنے سامنا رکھا ہوا رجسٹر جولی کو کھینچ مارا۔

"میں تمھارا منہ نوچ لوں گی" جُولی بھی چیختی ہوئی اپنا داہنا بازو پھیلا کر یوسف کی جانب بڑھی۔ لیکن اس سے قبل کہ اس کے ناخن یوسف کے چہرے تک پہنچیں، یوسف کا ہاتھ جُولی کے گریبان تک پہنچ گیا۔ وہ دانت پیس کر بڑبڑایا "حرامزادی آج میں تجھے سب کے سامنے ننگا کر دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے یوسف نے جھٹکا مارا تو اسکرٹ میں ٹنکے ہوئے نازک نازک ہُک اس دھچکے کے متحمل نہ ہو سکے، اُکھڑتے چلے گئے۔

جُولی اس سچویشن سے بوکھلا گئی۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کو چھپایا اور دُہری ہوتی چلی گئی۔

چیخ و پکار کی آوازیں سُن کر دوسرے لوگ بھی ادھر متوجہ ہو گئے

یوسف غصے میں اندھا پاگلوں کی طرح مغلظات بک رہا تھا اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ بھی چلتے جا رہے تھے۔ وہ کتابیں، رجسٹر، قلمدان جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگتا اُٹھا اُٹھا کر جولی

کی طرف پھینک رہا تھا۔

جیک نے آگے بڑھ کر یوسف کو روکنے کی کوشش کی لیکن نہ جانے کون سے جنون کے تحت یوسف میں بلا کی طاقت آگئی تھی۔ اس نے جیک کو بھی ایک ہلکے پھلکے رجسٹر کی طرح اُچھال پھینکا۔ اب چار آدمی یوسف سے لپٹ کر اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوسف اُن کے شکنجے سے نکلنے کے لیے اپنا زور صرف کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو کر اپنے حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ پھر اسی زور آزمائی میں یوسف کا جسم اکڑنے لگا۔ اس پر تشنج طاری ہو گیا۔ مینیجر جو پاس ہی کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا اس نے یوسف کو فرش پر لٹانے کا اشارہ کیا۔

آہستہ آہستہ یوسف کی تشنجی کیفیت ختم ہونے لگی تو جیک نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دائیں بائیں گھمائی، لیکن وہ بیہوش ہو چکا تھا اور اس کے بند جبڑوں سے سفید سفید رطوبت رِس کر باہر آرہی تھی۔

میڈم راسپوٹن

نام تو اُن کا روبی تھا لیکن ہم سب انھیں میڈم ہی کہا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں بلا کا رعب اور وقار تو تھا ہی ساتھ ہی حسن کا بے پناہ امتزاج جو ان کی شخصیت میں کشش کا باعث تھا وہ آج تک کسی دوسری عورت میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ گو کہ ان کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی بس اٹھائیس تیس کے درمیان ہوگی۔ ہم لوگوں میں بیشتر سے عمر میں وہ چھوٹی ہی تھیں لیکن اپنی شخصیت کی بنا پر وہ ہم سب پر چھائی رہتی تھیں۔

اور یہی وجہ تھی کہ کبھی کوئی بے تکلفی سے بھی ان کا نام روبی نہیں لیتا تھا۔ سب انھیں میڈم ہی کہتے تھے۔

پھر جب میں نے ان کا نام میڈم راسپوٹن رکھا تو وہ ان کی جاذب شخصیت پر ایسا کھپا کہ وہ میڈم راسپوٹن ہی مشہور ہوگئیں۔ میں نے راسپوٹن کا ٹائیٹل انھیں خوامخواہ نہیں دیا تھا۔

دراصل یہ حقیقت ہے کہ انھیں جو بھی دیکھتا انھیں کا ہو جاتا۔ عجیب مسکراتا ہوا چہرہ پایا تھا۔ بات کرتیں تو معلوم ہوتا پھول جھڑ رہے ہیں۔ خاموش بھی رہتیں تب بھی معلوم پڑتا مسکرا رہی ہیں۔

انھوں نے ہلکی نیلی آنکھیں پائی تھیں۔ ان آنکھوں میں غضب کا سحر تھا وہ اپنی نگاہ مخصوص جس کسی پر مرکوز کر دیتیں وہ سحر زدہ ہو کر ان کا تابع ہو جاتا۔

میں نے تو دیکھا نہیں میڈم نے کسی پر اپنی مخصوص نظر ڈالی ہو اور وہ ان کے نیرنگیٔ کمال سے بچ سکا ہو۔ بڑے سے بڑا زاہد اور پارسا ان کی قربت پاتے ہی پاش پاش

ہو جاتا ہم سب ان کے ہپناٹزم کے قائل تھے۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میرے تعلقات ان سے واجبی سے تھے بس معمولی سی شناسائی تھی کہ ایک شام وہ اپنے کسی بیمار دوست کو دکھلانے میرے مطلب پر آئیں جب میں مریض کا معائنہ کر چکا تو انھوں نے مریض سے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا اور خود میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے اندر سے پگھل رہا ہوں۔ ان کی آواز کی مترنم جھنکار میرے حواس پر چھاتی جارہی ہے۔ اور میں ان کے گلابی ہونٹوں کی لرزش سے جھڑتے ہوئے پھولوں کو چننے میں اتنا محو ہو گیا ہوں کہ خود کو بھلا بیٹھا ہوں، اپنے پیشے کو بھلا بیٹھا ہوں۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میری اس طرح کی شیفتگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر میں نے ان کی جانب سے اپنی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

تو میڈم ایک خاص ادا سے مُسکرائیں۔ گویا انھوں نے میرے دل کا حال جان لیا تھا۔

پھر اچانک انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں اُن کا چہرہ تکتا رہا۔ اور کوشش کرتا رہا کہ اپنی نگاہیں ان کی نگاہوں سے پھیر لوں لیکن ممکن نہ ہوا میری قوتِ ارادی نے ہاتھ پیر ڈال دیے۔

وہ خاموش مسکراتی رہیں اور میں مسحور ہو کر دھیرے دھیرے پگھلتا رہا۔

پھر وہ ایک عجب تحکمانہ انداز لیے جس میں ان کے لہجے کی تمام شیریں موجود تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر دھیرے سے بولیں۔

آج رات آپ میرے یہاں آرہے ہیں۔ میں اپنے حواس سنبھالنے میں لگا ہوا تھا اس سے قبل کہ ہاں یا نہ کروں ان کی عجیب سی سرسراتی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"آپ آج رات ضرور آیئے گا۔ میں انتظار کروں گی۔"

انھوں نے کچھ رُک کر "آپ ضرور آیئے گا میں انتظار کروں گی"۔ بڑے عجیب

اور بھاری لہجے میں کئی بار دہرایا۔ ہر دفعہ مجھے احساس ہوتا کہ ان کی آواز مجھے اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔

آہستہ آہستہ میں محسوس کرنے لگا کہ وہاں سوائے اُن کی آواز کی بازگشت کے اور کچھ نہیں ہے۔

ان کی آواز ہے اور میں ہوں۔

تمام احساسات سے مبرا ان کی آواز میرے چاروں طرف گردش کر رہی ہے۔ میرا وجود اس آواز کے حلقے میں گھرا ہوا ہے بس دُھند ہی دُھند ہے اور ان کی آواز کی بازگشت ہے۔

اس سے قبل کہ مجھے چکر آجائے ان کا سُریلا قہقہہ سُنائی پڑا۔

"کیا سو گئے... ؟ ہوش میں آؤ" یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ریشم سا ملائم ہاتھ رکھا۔

جیسے کوئی بجلی کے نکلے ہوئے کٹ آؤٹ کو کنکشن میں دوبارہ لگا دے۔ میرے حواس کا رشتہ میرے اعصاب سے منسلک ہو گیا اور میں واقعی ہوش میں آگیا۔ حیرت انگیز طور پر میرے اوسان بحال ہو گئے۔ اب میں ہر چیز کو دیکھ اور سمجھ سکتا تھا۔

اس سے قبل کہ میں ان سے کچھ کہوں انھوں نے "بائی..." کہا اور یہ جا وہ جا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی اب مریضوں کا معائنہ کرنے یا اُن کا احوال سُننے میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا جیسے تیسے کر کے میں نے اپنا کام ختم کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا میڈم کے یہاں جا پہنچا۔

آج میڈم خلاف معمول بالکل تنہا تھیں۔ اس وقت ان کی دھج ہی نرالی تھی اس انداز سے انھوں نے خود کو سنوارا ہوا تھا کہ خدا کی پناہ وہ اس دنیا کی مخلوق معلوم ہی نہیں پڑتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ فراعنۂ مصر کی کوئی شہزادی ہے جو سبک خرامی سے چہل قدمی کر رہی ہے یا کیوپڈ نے نزول کیا ہے۔

میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اچانک فضا نقرئی گھنٹیوں سے جھنجھنا اٹھی۔ میڈم کا قہقہہ بڑا

دل آویز تھا۔

کھڑے کھڑے منہ کیا تک رہے ہو آؤ... قریب آؤ... میں تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھیں اور انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اسے بوسہ دیا۔ ان کے ہونٹوں کے لمس سے ایک نرم نرم کومل سا احساس آتشیں لہروں میں تبدیل ہو کر میرے ہاتھ کی پشت سے گزر کر جگر تک اُترتا چلا گیا۔ میرے شریانوں میں خون کی روانی بڑھ گئی اور میرے پٹھوں میں تناؤ پیدا ہو گیا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے بڑے پیار سے ڈرائنگ روم میں مجھے لائیں اور ایک صوفے پر بٹھا کر خود سامنے بیٹھ گئیں پھر انھوں نے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں کہ بھئی تم تو ہمارے حلقے میں بہت کم آتے جاتے ہو تکلف بہت کرتے ہو، آتے رہا کرو۔ فائدے میں رہو گے ہماری مجلس میں بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ اعلیٰ حکام سے لے کر اس شہر کے بڑے بڑے بزنس مین تک، باتوں میں مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ ایک گھنٹہ بیت چکا ہے۔ میں تو اس وقت چونکا جب انھوں نے ملازم کو آواز دے کر کھانا لگانے کا حکم دیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں آج رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھانا اپنے گھر فون کر کے بتلا دو۔ شاید رات کو تم گھر سے باہر نہیں رہتے ہو۔ تمھارے گھر والے عادی نہیں ہوں گے۔ وہ پریشان نہ ہوں کہہ دو آج رات نہیں آسکوں گا اسپتال میں ڈیوٹی ہے۔

میڈم کی پرکشش شخصیت نے مجھے اندر سے جکڑ رکھا تھا، میں انکار نہیں کر سکا۔ ویسے میں بالکل نارمل تھا۔ میں نے گھر فون کر کے نہایت ڈھنگ سے بات بنا دی کسی کو شک تک نہیں ہوا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے باتیں شروع ہو گئیں۔ کیا دیکھتا ہوں ان کا ملازم ٹرالی ڈھکیلتا ہوا لیے چلا آرہا ہے جس میں کچھ فروٹس کے ساتھ ساتھ گلاس اور طرح طرح کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ میری آنکھوں میں اضطراب پڑھتے ہی میڈم نے مسکرا کر دریافت کیا۔

کیا شغل نہیں کرتے ؟ کبھی کبھار تو چل جاتا ہوگا ؟ کیا حرج ہے۔

میں اتنا ہی کہہ سکا "نہیں! میں عادی نہیں ہوں "

ان کا پھر وہی کھنکتا ہوا قہقہہ بلند ہوا " تو یہاں کون کمبخت عادی ہے۔ آپ جیسے دوستوں کی ہم نشینی کی خاطر ہم بھی یہ گناہ کر لیتے ہیں۔

پھر انھوں نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اُٹھائی اور مجھ سے مخاطب ہوئیں "کاک ٹیبل بنا دوں یا صرف کوئی ایک لوگے جو چاہے لے لو۔ جانی واکر، بلیک لیبل، مجھکا، شمپین، رائل سلوٹ سب موجود ہیں۔ کاک ٹیل ہارڈ ہو جائے گا۔ میرے خیال سے تم شمپین لے لو ہلکی ہوتی ہے۔

میں جو کہ موڈ میں آچکا تھا مسکرا کر بولا " اتنی ہارڈ تو پی چکا ہوں اب یہ بوتل کیا نشہ کرے گی "

" خوب بہت خوب " کہہ کر وہ اٹھلا کر کھڑی ہو گئیں۔ پوائزن پرفیوم کا ایک دلفریب جھونکا ان کی ساڑی کے لہرانے سے اُٹھا اور میرے شوق کو مزید بھڑکا گیا۔

پھر ہم دونوں کافی دیر تک دھیرے دھیرے شغل کرتے رہے۔ میں نے دیکھا میڈم کو نشہ نہیں ہو رہا ہے۔ جب کہ میں بہکنے لگا۔ ایک تو میڈم کا وجود ہی کیا کم تھا اوپر سے شراب دو آتشہ کا کام کرنے لگی۔

جب میری آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو گئے تو میڈم نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ مجھے بیڈروم میں لائیں۔ بیڈروم میں پاؤں رکھتے ہی میں لڑکھڑایا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نرم نرم زمین میں دھنس رہا ہوں۔ عجیب قسم کا انتہائی نرم قالین فرش کیا ہوا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن نشے کی جھونک میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور سیدھا میڈم کے اوپر آ رہا، تب مجھے احساس ہوا میڈم جسمانی طور پر بھی مضبوط ہیں۔ انھوں نے مجھے نہایت آسانی سے ہاتھوں پر روک کر سیدھا کھڑا کر دیا اور ہنس کر بولیں " خود پر قابو رکھو "

میں جو کہ میڈم کے لمس کو پا چکا تھا پاگل سا ہو گیا۔ میرے دماغ میں جلن ہونے لگی اور کانوں سے شعلے نکلنے لگے۔ سامنے ہی بیڈ تھا۔ میں قدم بڑھاتا ہوا بیڈ کی جانب لپکا

میڈم الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر لباس تبدیل کرنے باتھ روم میں چلی گئیں۔
اب جو میں نے گردن گھما کر ارد گرد دیکھا کمرے کی تمام دیواریں لُکنگ گلاس سے کور کی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف شیشے ہی شیشے تھے حتیٰ کہ باتھ روم اور داخلی دروازے تک پر بھی شیشے جڑے ہوئے تھے۔ سامنے شیشے کی ہی ایک الماری میں نہایت سلیقے سے مختلف قسم کی شرابیں سجی ہوئی تھیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پرفیوم کی مست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ عموماً اپنی خواب گاہ میں بلو یا ہرے رنگ کا بلب جلانا پسند کرتے ہیں لیکن یہاں کا ماحول عجیب اور پُراسرار تھا۔ تمام کمرے میں نہایت ہی سرخ رنگ کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو کمرے کی چھت کے وسط میں بنے ایک بڑے دائرے کے مختلف روزنوں سے پھوٹ کر فوارے کی شکل میں نیچے بکھر رہی تھی۔ اور نیچے سے اوپر تک بتدریج گہری ہوتی جاتی تھی۔ اس طرح پورا ماحول سُرخ ہو کر بڑا خوابناک ہو گیا تھا۔
ابھی میں کمرے کا پوری طرح جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ میڈم شب خوابی کے لباس میں سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ باریک لباس میں ان کا دودھ جیسا میدے کا جسم لال روشنی میں نہایا ہوا سرخ گوں ہو رہا تھا۔ مہین جالی کی چلمن کے جھروکوں سے جھانکتے ہوئے ان کے انگ میرے ہیجان کو ہوا دینے لگے۔ میرا تنفس تیز ہو گیا اور میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ایک بار پھر میرے کان جھنکنے لگے۔ اس سے قبل کہ میں بے قابو ہو جاؤں اور بستر سے چھلانگ لگا کر میڈم کو جا دبوچوں۔
وہ میرے ارادے کو تاڑ گئیں اور مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر ہاتھ سے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میں مبہوت ہو کر وہیں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔
پھر انھوں نے عجیب کھیل شروع کر دیا۔ وہ مسہری کے گرد آہستہ آہستہ چکراتی رہیں اور میں بے خودی کی حالت میں ان پر اپنی نگاہیں مرکوز کیے ہوئے ادھر سے اُدھر انھیں تکتا رہا کمال کی بات یہ ہے میرا شعور بیدار تھا اور مجھے بخوبی احساس تھا کہ میں بے بس ہو گیا ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ میرے نزدیک آ کر بستر پر بیٹھ گئیں اور مجھے طرح طرح سے ہلکان کرتی رہیں۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ یہاں تک کہ میرے حواس شل ہو گئے۔ میری پلکیں جھپکنے لگیں۔

اور میرے منہ سے سرد آہیں نکلنے لگیں۔ جب میں جذبات کی شدت سے بیتاب ہو کر نڈھال ہو گیا تو میڈم کا وہی پُرانا کھنکتا ہوا قہقہہ سُنائی دیا۔

"کیا سو گئے... ہوش میں آؤ" پھر انھوں نے دھیرے سے میرے گال تھپتھپائے ان کے اس عمل سے ایک کرنٹ میرے اندر دوڑ گیا۔ توانائی میرے جسم میں لہریں لینے لگی اور میری ساری تھکن اور غنودگی کافور ہو گئی۔

اب ان کے سامنے ایک مشتعل بھیڑیا بیٹھا تھا جو اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے زاویہ تلاش کر رہا تھا۔ اس سے قبل کہ بھیڑیا جست لگائے شکار نے پہلو بدلا اور بڑی ادا سے خود کو بیتاب درندے کے سپرد کر دیا۔

پھر دھیمی مترنم ہنسی بھوکی اور بیتاب غراہٹوں میں مدغم ہوتی رہی۔

اس کے بعد نہ جانے کتنے دن تک میں ان کے قرب کو ترستا رہا ایک روز کرنل صاحب میرے پاس آئے اور بولے "ڈاکٹر صاحب! آپ کو میڈم یاد کر رہی ہیں، آج شام ضرور آئیے۔" میں بھلا کب انکاری تھا جا پہنچا۔

دیکھا محفل جمی ہوئی ہے مگر ماحول کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ مسئلہ میڈم کی شادی کا چھڑا ہوا ہے۔ ایک لڑکا چاہیے جس سے میڈم کی شادی کر دی جائے کیوں کہ پاس پڑوس والوں کا شک بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں اُن کا تنہا رہنا ٹھیک نہیں ایسا نہ ہو بات بگڑ جائے۔ شوہر کے نام کا سائن بورڈ ضروری ہے۔ مجھے اس لیے بلایا گیا ہے کہ میرے نرسنگ ہوم میں ایک کلرک ہے جو کرنل صاحب کا دور کا رشتہ دار لگتا ہے۔ اس پر کرنل صاحب کی نظر ہے۔

میں نے کہا "وہ غریب تو سیدھا سادہ ہے اور آئی اے فیل ہے۔"

کرنل صاحب مُسکرا کر بولے "فکر مت کرو ہم ایم اے پاس مشہور کر دیں گے ڈگری کوئی چیک کر رہا ہے۔ سیدھا سادہ آدمی ہی ہمیں چاہیے۔ سوسائٹی کا مینرز اسے سکھا دیں گے۔"

میں نے جواب دیا "میں کوشش کروں گا شاید لائن پر آ جائے۔"

کرنل صاحب بے ساختہ ہنس دیے اور بولے "کوشش کس چڑیا کا نام ہے۔ میڈم کی کتاب میں لفظ "نہیں" کہیں لکھا ہوا نہیں ہے۔ آپ اسے یہاں لائیے تو۔۔۔!"

اور پھر واقعی یہی ہوا، مجھے قطعی اُمید نہیں تھی کہ کیلاش میڈم سے شادی کے لیے راضی ہوگا، مگر میڈم واقعی حیرت انگیز ہیں۔ دو ایک ملاقاتوں میں ہی وہ ان کے گرد ناچنے لگا اور پندرہ دن کے اندر ہی ان کے گیٹ پر مسٹر کیلاش درپن کے نام کی تختی لگ گئی اور میڈم مس روبی سے مسز کیلاش درپن بن گئیں۔

کیلاش کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ علاء الدین کو چراغ ملنے سے بھی اتنی خوشی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔ جتنی خوشی کیلاش میڈم کو پاکر کر رہا تھا۔ دولت کی فراوانی میڈم کا حسین پیکر، جس کے لاکھوں تمنائی تھے، شیدائی تھے اور اپنی اس فریفتگی میں ہزاروں لٹانے کو تیار رہتے تھے۔ وہ سب کچھ کیلاش کے یوں ہاتھ آگیا تھا جیسے ریڈ کراس کے معمولی سی قیمت کے ٹکٹ پر دس کروڑ روپے کی لاٹری اس کے نام نکل گئی ہو۔

ایک ہفتے تک تو کیلاش کی خوب موج رہی۔ پھر میڈم اپنے دھندے میں لگ گئیں۔ گو کہ کیلاش کو قبل ہی اشاروں کنایوں میں سب کچھ بتلا دیا گیا تھا پر ایسا بھی کیا کہ خمار تو ابھی چڑھا بھی نہیں تھا کہ جام دوسروں کے ہونٹوں سے جا لگا۔ اب جام پوری بزم میں گردش کر رہا تھا اور اس غریب کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی باری کب آئے گی۔ دن یوں ہی گزرتے رہے اور کیلاش اپنے تشنہ لبوں پر زبان پھیرتا رہا پیاس بڑھتی ہی رہی آخر کار چھوٹی سی کشتی کا یہ مسافر بیچ سمندر میں اپنی ناؤ کھیتے کھیتے پیاس سے مجبور ہوکر جان کی بازی لگا بیٹھا۔ اس کی دست درازی سے میڈم برہم ہوگئیں اور انھوں نے اس کو بری طرح جھڑک دیا تو جذبات کا بپھرا ہوا سمندر اپنی بے بسی اور بے توقیری کے احساس سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

کچھ دن اور گزرے۔ ایک رات دونوں کو کسی پارٹی میں ساتھ جانا تھا۔ کیلاش ڈرائنگ روم میں بیٹھا میڈم کے تیار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ سنگھار

کر کے سامنے آئیں تو کیلاش پر بجلیاں گر پڑیں۔ اس کی قوتِ برداشت جل کر راکھ ہوگئی وہ اپنی فرزانگی کھو بیٹھا دیوانگی میں اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ پارٹی میں جانے کے لیے میڈم نے اپنے میک اپ پر بہت محنت کی ہے۔ اپنے میک اپ کا یوں ستیاناس ہوتے دیکھ کر میڈم چراغ پا ہوگئیں اور انھوں نے ایسی کھری کھری سنائیں کہ کیلاش کے آنسو نکل آئے۔

آہستہ آہستہ کیلاش دل برداشتہ ہوتا گیا اور اس کے اندر کا وہ مرد جاگ گیا جو کیسا ہی مجبور کیوں نہ ہو پر وہ کبھی بھی یہ برداشت نہیں کرتا ہے کہ اس کی عورت کسی دوسرے کے پہلو میں جائے۔ قاعدہ ہے دوسرے کی عورت سے ہر کوئی پیار کرے گا لیکن اپنی عورت کو دوسروں کے حوالے کرنا بُرے سے بُرا مرد بھی پسند نہیں کرتا۔ کیلاش کی بھی غیرت جاگی تو وہ بارود کی طرح پھٹ پڑا۔

میڈم نے سب کچھ ٹھنڈے دل سے سُنا اور بولیں "زیادہ حساس بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا سامان اُٹھاؤ اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

اس طرح میڈم ایک بار پھر تنہا ہوگئیں۔ شوہر کے نام کا سائن بورڈ تو ان کے مکان پر لگ ہی چکا تھا اور پھر وہ تنہا کب تھیں ان کے اشارے پر ہم سب اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے۔ ہم لوگ میڈم کو خوش کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کو قیمتی سے قیمتی تحائف دیتے۔ یہاں تک کہ بلینک چیک تک پیش کر دیا کرتے۔ میڈم کا گھر کیا تھا گویا ایک کلب تھا جہاں ہر روز رات کو لوگ جمع ہوتے تھے۔ بڑے سے بڑے سیٹھ بزنس مینوں سے لے کر شہر کے اعلیٰ حکام، پولیس کے افسران سب ان کے حلقہ بگوشوں میں شامل تھے۔

وقت آہستہ آہستہ گذرتا رہا اور میں M.R.C.P کی ڈگری لینے انگلینڈ چلا گیا۔ اس کے بعد آئرلینڈ، لیبیا اور پھر نائیجیریا میں رہتا رہا۔

اب تقریباً بیس سال بعد میں وطن واپس آیا ہوں۔ ایک لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں میڈم کو نہیں بھلا سکا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے میڈم سے ملنے کا خیال آیا۔ شام تک

اپنے عزیز و اقارب سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑایا اور میں میڈم کے یہاں جا پہنچا لیکن وہاں کی تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میڈم کا یہ حال ہو جائے گا۔

وہ ایکدم ڈھل گئی تھیں۔ افسردگی اور تنہائی نے اپنی لپیٹ میں لے کر انھیں وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک میں ان کے خدوخال کے کھنڈرات میں گھومتا رہا وہاں اب شکستگی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وقت نے پوری عمارت کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں جن کی وجہ سے میں نے انھیں راسپوٹن کا خطاب دیا تھا کسی قدر اندر کو دھنس کر اپنی کشش کھو چکی تھیں۔ گال پچک گئے تھے اور ان کے اوپر ہڈیاں ابھر آئی تھیں ستواں ناک نیچے جھک آئی تھی۔ ساغر جیسے مدھ کے بھرے ہونٹ اپنی تمام شراب لنڈھا دینے کے بعد خشک ہو کر سکڑ گئے تھے۔ چہرہ جہاں جوشِ شباب کے ارغوانی پھول لہلہاتے تھے اب کسی خشک سال کھیت کی طرح ویران نظر آ رہا تھا۔

مجھے یوں اچانک دیکھ کر وہ رونے لگیں اور روتے روتے بدقت بولیں "اب ان کے پاس کوئی نہیں آتا۔ وہ قیدِ تنہائی کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ اسی چیز نے ان کے دماغ کو ٹینشن میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ زبردست فرسٹریشن کا شکار ہو کر ڈپریشن کی مریضہ بن گئی ہیں۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میرے دلاسہ دینے پر کچھ شانت ہوئیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں "دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا ہے پر رات نہیں کٹتی۔ یہ تنہائی کے ناگ مجھے راتوں کو ڈستے ہیں۔ تم کہیں سے کیلاش کو تلاش کر کے لا دو تو مجھ پر بہت احسان ہوگا۔ اس نے مجھے طلاق نہیں دی تھی۔ میں آج بھی مسز کیلاش درپن کہلاتی ہوں۔ اور اس کے نام کی تختی بھی ابھی تک گیٹ پر لگی ہوئی ہے۔"

میں نے وعدہ کیا کہ میں کیلاش کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ پھر جہاں جہاں ممکن تھا میں نے کیلاش کو تلاش کیا مگر بے سود۔ میڈم کی حالت روز بروز خراب ہوتی رہی۔ اس عرصہ میں میں نے نرسنگ ہوم دوبارہ جوائن کر لیا تھا۔ میں نے میڈم کو وہیں بھرتی کرا دیا۔

ایک روز ان کی طبیعت بہتر تھی۔ میں نے ان کے لیے سائیکیٹرسٹ کو بلوایا تھا۔

ڈاکٹر اُبا اور مجھ سے ملاقات کے لیے میرے روم میں ہی آ بیٹھا ہوں کہ اس وقت میں مصروف تھا۔ میں نے میڈم کو بھی وہیں بلوالیا تاکہ ڈاکٹر جب ان کے ذہن کو کریدے تو میں بھی موجود رہوں اور کیس کو اپنے طور پر سمجھ سکوں۔

ڈاکٹر ان سے سوالات کر رہا تھا اور وہ جوابات دے رہی تھیں اور میں... میں کسی دوسری دنیا میں ہی کھو گیا تھا۔ کل کی بات ہے یہی کمرہ تھا۔ میڈم تھیں اور میں تھا۔ میڈم نے اپنی انھیں آنکھوں سے مسحور کر کے مجھے اپنے قابو میں کر لیا تھا اور آج جب کہ پچیس برسوں کی قلیل سی مدت گذری ہے انھیں تنہائی اور مایوسی نے شکستہ کر کے کھنڈر بنا دیا ہے۔ وہ نگاہیں جو مسکرا مسکرا کر افسوں پھونکا کرتی تھیں۔ آج اپنی ویرانی دل کا قصہ اپنے معالج کو سنانے سے کترا رہی ہیں۔

میں انھیں سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھُلا اور میری بیوی غصے میں بھری ہوئی اندر داخل ہوئی اور میری جانب تیکھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"کیا بھول گئے؟ ریشما کو دیکھنے آج اس کے سسرالی آنے والے ہیں گھر کب جاؤ گے؟ جب وہ واپس چلے جائیں گے تو...؟

پھر جیسے ہی اس کی نظر میڈم پر پڑی اس نے نہایت حقیر لہجے میں ایک تیر پھینکا۔

"اوہو...! تو یہ بات ہے۔ جبھی تو میں سوچ رہی تھی اتنے بے فکرے تو آپ کبھی تھے نہیں؟

کسی نے سچ کہا ہے چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا آپ اس ویران اور شکستہ عمارت کے ملبے میں کون سے نوادرات تلاش کرنے چلے آتے ہیں۔ آثار قدیمہ سے تو کوئی دلچسپی کبھی آپ کو رہی نہیں...؟

اس سے قبل کہ میری بیوی کچھ اور جلی کٹی سُنائے کمرے میں ایک چیخ گونجی۔

"بس کرو... رحم کرو... میرے اوپر رحم کرو"

میں نے گھبرا کر میڈم کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھیں اپنے حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں جب تک میں آگے بڑھ کر انھیں سنبھالوں ان کا سر کرسی کی پشت سے ٹک گیا اور

ان کے چہرے پہ تاریکی چھانے لگی۔ اُن کی آنکھیں بتدریج بند ہوتی چلی گئیں۔ میں نے نبض دیکھی۔ رفتار ایک سو سے اوپر تھی۔ میں نے چیخ کر نرس سے سڈیکسن کا انجکشن تیار کرنے کو کہا۔ مجھے شک ہو گیا چراغ بھڑک رہا ہے اور بجھنے کو ہے۔

جب تک نرس انجکشن تیار کر کے لائے ان کی نبض کی رفتار میں کمی واقع ہونے لگی ان کا جسم سرد سے سرد تر ہوتا چلا گیا انھوں نے دو تین سسکاریاں بھریں ـــــ ان سسکاریوں کے درمیان صاف سُنا گیا۔ وہ کیلاش کو پکار رہی تھیں۔

اس بڑبڑاہٹ کے دوران ان کی ناک سے خون بہنے لگا شاید برین ہیمرج ہوا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

جواب

وجے گنگناتا ہوا اپنے بیڈروم میں داخل ہوا اور اپنا کوٹ اُتار کر ہینگر پر ڈالنے لگا تو اس کی نظر اپنی پتنی کُسم پر پڑی جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنا میک اپ کر رہی تھی۔ وہ مُسکرا کر بولا "شریمتی جی کیا ارادے ہیں؟ آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟ بھلے ہی میں پندرہ دن بعد ٹور سے لوٹا ہوں پر قطعی طور پر ابھی پری پیر نہیں ہوں، کل رات اپنے ڈسٹری بیوٹر نے پارٹی دی تھی وہاں شراب و شباب سب کچھ تھا۔ بس ایسے ہوش اُڑے کہ ہوش ہی نہ رہا۔

"کیا...؟" کُسم نے آنکھیں نکالیں۔

"بھئی کیا کریں سوسائٹی بھی تو نبھانا پڑتی ہے۔" پھر ہنس کر بولا "دو ایک روز اور جانے دو۔"

کُسم نے قہر آلود نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ دھیمی دھیمی آنچ پر پکتی ہانڈی کا اُبال یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی گیس کے چولھے کا برنر اچانک بند کر دے۔ وہ لپ اسٹک کو ٹیبل پر پٹخ کر کھڑی ہو گئی۔

وجے "ارے ارے" کہتا ہوا اس سے لپٹ گیا "بھگوان قسم تم غصّے میں اور بھی سُندر لگتی ہو! بھئی ہم تم سے کچھ بھی نہیں چھپاتے سب باتیں بتلا دیتے ہیں۔"

کُسم نے خشمگیں نگاہیں اپنے پتی پر ڈالیں اور چُپ ہو رہی۔

بات بھی یہی تھی۔ وجے اپنی کوئی بات اس سے چھپاتا نہیں تھا۔ پہلے تو اسے ان سب باتوں سے بہت دُکھ ہوتا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ عادی ہوتی گئی۔

ہائی سوسائٹی میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔ گھر کا کھانا کھاتے کھاتے

جب جی اوب جائے تو ہوٹل کا رُخ کرنا ہی پڑتا ہے۔ کُسم بھی اُسی سوسائٹی کی ایک فرد تھی اور کچھ ایسی ہی باتوں پر یقین رکھتی تھی کہ اگر انسان کے فطری تقاضوں پر بندش کر دی جائے تو ماحول میں گھٹن پیدا ہو جاتی ہے اور سماج کی گھٹن سے ہمیشہ دھماکے پیدا ہوتے ہیں پھول نہیں کھلتے۔

اس کی شادی کو سات برس ہونے جا رہے تھے۔ ان سات برسوں میں اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اُس کے گھر میں بھی آئے دن پارٹیاں ہوتیں۔ سب مل جُل کر شراب پیتے، مستیاں کرتے، قہقہے لگاتے اور کبھی کبھی یہ مستی نقطۂ عروج پر پہنچ کر وجہ اتصال بھی بن جاتی یہ جسمانی اتصال فیشن کا ایک جزو ہی سمجھا جاتا۔

وجے نے کُسم کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور بولا "کم آن ڈارلنگ چلو سو جائیں کل بہت کام ہے گھر میں پارٹی بھی ہے۔"

ان سب باتوں کی عادی ہونے کے باوجود بھی نہ جانے کیوں کُسم کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ کوفت کی وجہ سے وہ پچھلے پہر تک جاگتی رہی، مگر دوسرے روز وہ سب کچھ بھول کر پارٹی میں لہراتی پھر رہی تھی۔

پارٹی شباب پر تھی۔ کُسم مہمانوں کو وہائٹ ہورس سرو کر رہی تھی۔ وہسکی کے سرور میں وہ کچھ زیادہ ہی شوخی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ کسی بات پر ہنستے ہوئے وہ راجندر کی جانب ٹرے بڑھا رہی تھی کہ اچانک وہاں کھڑا ہوا کمل اپنی جگہ سے گھوما تو اس کی کہنی کُسم کے بازو سے جا ٹکرائی۔ کُسم بیلنس نہ رکھ سکی اور ٹرے کے گلاس نیچے لڑھک گئے۔ وہسکی کُسم کی ساڑی پر آگری جس سے رنگین ساڑی پر دھبے نمایاں ہو گئے۔

کمل نے بوکھلا کر سوری کہا اور جھک کر اپنے رومال سے کُسم کی ساڑی صاف کرنے لگا۔

راجندر نے کمل کو جو کُسم کے پیروں پر جھکے ہوئے دیکھا تو نشے میں نہ جانے کیا سمجھا اور ایک قہقہہ لگایا۔

قہقہے کی آواز پر سب ادھر متوجہ ہو گئے تو وجے بھی شرارت سے بولا "بھئی میری پتنی کی ساڑی تو چھوڑو۔ وہسکی تمھیں اور مل جائے گی۔"

کمل نے جو دیکھا سب اس پر ہنس رہے ہیں تو وہ جھینپ مٹانے کے لیے فوراً بولا۔" اور ہے تو جلدی لاؤ۔"

"کُسم دوڑ کر گئی اور فریج سے نئی بوتل نکال لائی۔

وجے نے کہا " لو پیو کتنی پیو گے؟"

راجندر اس کو چڑانے کے لیے بولا "کیوں تمھیں کیا ہوا کیا دم نہیں رہا؟"

وجے مُسکرایا اور بولا " ارے یہ تو بوتل ہے ہم تو پورا ڈرم چڑھا جائیں "۔ یہ کہہ کر وہ غٹا غٹ کئی گھونٹ لے گیا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ لوگ واپس جا رہے تھے۔ راجندر نے نشیلی آنکھوں سے کُسم کو دیکھا اور بولا " کیا اب گھر جائیں؟"

کُسم مُسکرا کر بولی " مت جائیے یہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔"

راجندر برجستہ بولا " اچھا ہمیں معلوم نہ تھا یہ گھر بھی ہمارا ہے "۔ پھر اپنا پھیلا ہوا ہاتھ نچا کر بولا " اس میں ہمارا کیا کیا ہے ہمیں تو معلوم ہی نہیں۔"

کُسم نے اپنی چٹکی سے راجندر کی ناک پکڑ کر ہلائی اور بولی 'سناٹی بوائے'۔

تھوڑی ہی دیر میں راجندر واپس آ گیا۔ اس کی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ بقیہ لوگ جا چکے تھے۔

راجندر کی گاڑی کی خرابی کا سُن کر وجے نے اس سے کہا " رات زیادہ گزر چکی ہے اب ٹیکسی کا ملنا بھی محال ہے یہیں سو جاؤ اور گھر فون کر دو۔"

راجندر نے شرارت سے کُسم کی جانب دیکھ کر کہا " مگر بھابی تو بُرا مانیں گی۔"

" او ڈیئر کم آن! " وجے راجندر کا ہاتھ پکڑ کر بولا اور اپنے بیڈ روم کے پاس آ کر رُک گیا۔ نشے اور نیند سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملازم کو بلایا اور اس سے بولا " انھیں مہمانوں والا کمرہ دکھلا دو " پھر راجندر سے بولا " سوری میں چلتا ہوں مجھے نیند کی دیوی پکار رہی ہے۔"

راجندر نے بھی ہاتھ ہلایا " او کے گڈ بائی اینڈ گڈ نائٹ۔"

کُسم نے بچّوں کا کمرہ بند کیا اور راجندر کے کمرے میں آکر دریافت کیا۔ ایئرکنڈیشنر تیز تو نہیں چل رہا ہے؟ سوتے وقت ٹیوب بند کر کے نائٹ لیمپ جلا لیجیے گا۔ سوئچ بورڈ اس طرف ہے۔" وہ اشارہ کر کے بولی۔

"سونے کا وقت اور کب آئے گا۔ دو بج رہے ہیں پلیز آپ ہی تکلیف کر لیں۔" راجندر نے مسکرا کر کہا۔

کُسم نے نائٹ لیمپ آن کیا اور ٹیوب بجھا کر جیسے ہی مڑی اُسے اپنی کمر کے گرد ایک مضبوط ہاتھ کا احساس ہوا۔ اپنی کمر کو آزاد کرانے کے لیے اضطراری طور پر وہ تڑپ کر گھومی۔ تو بس گھوم کر ہی رہ گئی۔ راجندر کی فرنچ کٹ ڈاڑھی کا کرخت کھردرا اس کے گالوں سے ہوتا ہوا گردن تک بکھر گیا۔ اس کی چبھن سے کُسم کے پورے جسم میں ایک لہر سی اٹھی اور اس کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کا دل پگھل رہا ہے۔ نکوڈین آلود گرم بھپکے سے اس کی سانس ٹکرائی اور اس نے اپنے تیز ہوتے ہوئے تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی کی "یہ کیا کر رہے ہیں؟"

جواب میں راجندر نے کیا کہا وہ سُن ہی نہ سکی۔ اُس کے کانوں میں تو وجے کی آواز گھوم رہی تھی۔ پھر تو ایسے ہوش اُڑے کہ ہوش ہی نہ رہا...

کُسم کے پٹھے اینٹھنے لگے اور تمام بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس نے محسوس کیا راجندر نے بڑی بے تابی سے اس کے جسم سے چیونٹیاں نوچنا شروع کر دی ہیں۔

جذبات کا سمندر اُبل پڑا اور بپھری ہوئی موجوں میں اس کا وجود ڈولنے لگا۔ اس سے قبل کہ کوئی تھپیڑا اُسے بہا کر لے جائے اس کے کان میں ایک سرگوشی سُنائی دی "کُسم! یہ کیا کر رہی ہے؟ ہوش میں آ ورنہ برباد ہو جائے گی۔"

"کیوں...؟ میں برباد کیوں ہو جاؤں گی؟ وجے بھی تو ہمیشہ من مانی کرتا ہے۔"

"وجے کی بات اور ہے، وہ مرد ہے اور یہ سماج صرف مردوں کا ہے۔ اس میں عورت کے لیے کوئی رعایت نہیں نکلتی۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی۔ یاد رکھ تو آج ڈوبی تو پھر کبھی نہ اُبھر سکے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گی۔"

کُسم نے ایک جھرجھری لی اور اچانک اپنے ناتواں بازوؤں کو سمیٹ کر جھٹکے سے جو پھیلایا تو رسّی ٹوٹ چکی تھی اور شکاری بستر پر گرا ہوا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

کُسم کے منہ سے اتنا ہی نکلا "نو مور پلیز" دروازہ دھڑام سے بند ہوا اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی۔

بیڈ روم میں پہنچ کر اُس نے دیکھا وجے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ بے سُدھ ہو کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اس پر آگری۔ وجے نے نشے میں ڈوبی ہوئی اَدھ کھُلی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور اس کو خود سے الگ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "یار کیوں پریشان کرتی ہو، سونے بھی دو"

کُسم کو بے بسی کا احساس شدت سے ہوا۔ اُس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ اس نے اپنا تکیہ گھسیٹ کر سیدھا کیا اور اوندھی ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ غنودگی آتی پھر اُسے اپنی گردن پر ایک کرخت کھردرے کا احساس ہوتا تو اس کے پٹھے اینٹھنے لگتے اور جذبات کے ساگر میں موجیں تڑپنے لگتیں۔ پھر یہ موجیں اوپر اور اوپر اُٹھتیں تو اس کا وجود ڈوبنے لگتا۔ اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اپنی گردن اُٹھا کر بے خبر سوتے ہوئے وجے کی جانب دیکھتی اور پھر تکیے پر سر رکھ کر کروٹ لے لیتی۔ کبھی پریشان ہو کر وہ اپنی سپاٹ آنکھوں سے چھت کو تکنے لگتی۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا گویا دروازے پہ کھٹکا ہوا ہے تو چونک کر دروازے کی جانب دیکھتی لیکن وہاں مکمل خاموشی ملتی۔ آسودگی کے دروازے کو تو وہ خود ہی بند کر آئی تھی۔ اسی طرح اس کے حواس رات بھر آنکھ مچولی کھیلتے رہے پھر صبح دم وہ پریشان ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی اُس نے وجے کی الماری کھول کر نیند لانے والی پلز نکال کر منہ میں رکھیں اور پانی کے گلاس کو ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

صبح وجے سو کر اُٹھا تو اس نے کُسم کو آوازیں دیں۔ کُسم نے آنکھ کھولی اور کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ آج دیر تک سوتے رہنے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس نے حیرت سے کُسم کو دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر تک وہ دانتوں میں پیسٹ کرتا رہا۔ پھر اُس نے راجندر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا "ارے بھئی کیا آج آفس نہیں جاؤ گے؟"

راجندر نے دروازہ کھولا تو رات کی کہانی اس کے چہرے پہ نقش تھی۔ ہونٹوں اور

گالوں پر ہلکے ہلکے سُرخ دھبے رات کی ادھوری واردات کی بڑھا چڑھا کر چغلی کھا رہے تھے۔

وجے نے چونک کر راجندر کے چہرے کو دیکھا اور غصّے میں بل کھا کر رہ گیا۔

اُس کے بعد سے وجے کا منہ پھول گیا اس کی سزا اُس نے کُسم کو یہ دی کہ وہ اپنی راتیں زیادہ تر باہر گزارنے لگا۔

اسی تناؤ میں دو مہینے گزر گئے۔ ایک دن سہ پہر کو انکم ٹیکس کی فائل لینے وہ گھر پہنچا تو دیکھا بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ دونوں بچّے باہر کھیل رہے ہیں۔ اس نے ریما سے پوچھا "ممی کہاں ہیں؟"

"وہ ماسٹر صاحب سے کچھ ٹوئٹنگ لے رہی ہیں۔"

وجے کے احساس پر شک و شبہ کے بچھو رینگنے لگے۔ غصّے کی زیادتی سے اس کے سینے کی دھونکنی چلنے لگی۔ اس نے دیوانہ وار بیڈروم کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

کُسم نے دروازہ کھولا۔ اور باہر جھانکتے ہوئے وہ شیرنی کی طرح دہاڑی "کیا ہے کیوں شور مچا رہے ہو؟"

وجے دندناتا ہوا سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ تیس بتیس سالہ ایک جوان صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے جیسے ہی وجے کو دیکھا تو اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "نمستے!"

وجے نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کُسم سے دریافت کیا "یہاں کیا ہو رہا تھا؟"

"تماشہ!" کُسم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

وجے کی آنکھیں غصّے سے سُرخ ہو گئیں "کیا مطلب؟"

"مطلب کیا، اس گھر میں تماشہ ہی تو ہو رہا ہے۔"

ماسٹر بے چارہ جو حیرت سے وجے کو دیکھ رہا تھا اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اُس نے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

"بند کمرے میں یہاں کیا ہو رہا تھا؟" وجے ایک بار پھر غرّایا۔

کُسم بھی چیخ کر بولی "کہہ تو دیا تماشہ، تم جو اپنی راتیں باہر گزارتے ہو میں نے تو تم سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔"

"فضول بکواس نہ کرو۔ آخر سوسائٹی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔" وجے مزید غضبناک ہو گیا۔

کُسم بھی بپھر گئی "وجے! اپنی فطرت اور اپنی خواہشوں کو سوسائٹی کے پردے میں مت چھپاؤ۔ تم جو مجھے اتنے دن سے جلا رہے ہو تو کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے میں بھی انسان ہوں۔ میری فطرت کے بھی کچھ تقاضے ہیں، اگر میں بھی تمھاری طرح سوسائٹی نبھاتی پھروں تو کیا ہوگا؟ لیکن میں ایسا نہیں سوچتی اور تم ہو کہ سر پہ چڑھے آرہے ہو۔"

وجے طنزیہ انداز میں مُسکرایا "اوہو! تو تم اپنی فطرت کے تقاضے اس دو کوڑی کے ماسٹر سے پورے کروگی تاکہ وہ گھٹیا آدمی تمام میں گاتا پھرے۔ یاد رکھو کل سے وہ ماسٹر کا بچہ اس گھر میں قدم نہ رکھے۔"

کُسم ہونٹ سکوڑ کر بولی "شرم کرو۔ کیوں خواہ مخواہ کسی کو بدنام کرتے ہو۔"

وجے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے الماری کھول کر فائل نکالی اور غصّے میں پاؤں پٹکتا باہر نکل گیا۔

کُسم نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اور کھڑی ہوئی نفرت سے ہونٹ چباتی رہی — اچانک اُس کی نظر آئینے پر گئی جہاں اُس کا سراپا نظر آرہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بغور دیکھتی رہی اور سوچتی رہی شادی کے بعد سے آج تک اس نے اپنے آپ کو کس کس جتن سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ ان چھ سالوں میں اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی جس کی نشاندہی کی جاسکے۔ اُس کے جسم کی تراش سے لے کر چہرے کا روپ اور دلکشی آج بھی ویسی ہی تھی جیسی کالج کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے کالج کی حسین لڑکی کہلاتی تھی اور آج بھی جس محفل جس پارٹی میں وہ چلی جاتی لوگوں کی نگاہیں بے ساختہ اس کی جانب اُٹھ جاتیں۔ زیادہ تر مرد اسی کے گرد منڈلاتے رہتے جو نشے میں ہوتے وہ بھی اور جو نشے میں

نہیں ہوتے وہ بھی خود کو نشے میں پوز کرتے ہوئے اسی سے اٹکھیلیاں کرتے رہتے۔
پھر اس کی ذہنی رو وجے کی جانب چلی گئی۔ وجے کبھی بھی اسمارٹ نظر نہیں آیا اور اب تو اس کی اچھی خاصی توند نکل آئی تھی۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے تھے جس کو وہ ہیئر ڈائی سے چھپاتا تھا۔ پھر اس کا خیال ماسٹر کی جانب گیا۔ تیس بتیس سال کا سانولا سلونا ماسٹر چوڑی چھاتی اور اپنے مضبوط بازوؤں کے ساتھ خاصہ دلکش تھا۔ جس سے گھر میں روز ہی ملاقات ہوتی تھی لیکن اس کے بارے میں کبھی ایسا ویسا خیال بھی نہیں گیا۔ مگر وجے حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔ بے عزتی کے احساس سے اس کی آنکھیں چھلک آئیں اور وہ بستر پر گر کر سوچتی رہی
شام کو وہ اٹھی تو جی اچاٹ تھا۔ دل پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے میک اپ درست کیا اور شاپنگ سینٹر کی جانب نکل کھڑی ہوئی۔ لینا دینا تو کچھ تھا نہیں بس دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی سڑک کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی کہ عقب سے کسی کار کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اپنے خیالات میں غرق بائیں جانب دب گئی۔ ایک زوردار ہارن پھر بجا۔ وہ اور دب گئی۔ اس بار گاڑی نے پیچھے سے اس کی ٹانگوں میں دھیرے سے ٹکر ماری تو اس کا استغراق ٹوٹا اور وہ غرّا کر پلٹی تو کار سے باہر سر نکالے راجندر بیٹھا ہنس رہا تھا۔
"کہیے کیا مرنے کا ارادہ ہے؟"
کسم کی زبان سے بے ساختہ نکلا "ہاں مرنے کا ہی ارادہ ہے۔"
لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کر کے راجندر بوکھلا گیا اور بولا "میں تو مذاق کر رہا تھا آپ برا مان گئیں۔"
"برا مان جاتی تو گاڑی کے نیچے نہ لیٹ جاتی۔ اب تک برا ہی تو نہیں مانا ہے۔"
"بات کیا ہے؟ آخر آپ اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟" یہ کہتے ہوئے راجندر نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کی دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور اسے اپنی برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "چلیے چائنیز چلتے ہیں۔"

کُسم خاموشی سے اس کے برابر بیٹھ گئی۔

رات کو وجے گھر نہیں آیا تھا۔ صبح وہ گھر پہنچا تو اُسے آیا سے معلوم ہوا کُسم کل شام کی گئی ہوئی ابھی تک نہیں لوٹی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ٹیلی فون آیا ہے۔ بچے اسکول نہیں گئے۔ روتے روتے ابھی سوئے ہیں۔ باورچی الگ بیٹھا ہوا ہے کیا پکے گا کون بتلائے؟ وجے چکرا کر رہ گیا۔ اُسے غصّہ تو بہت آیا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ بچوں سے متعلق آیا کو ہدایت دیتا ہوا وہ آفس روانہ ہوگیا۔ یہاں دفتر میں بھی اس کا جی نہیں لگ رہا تھا اُس نے بار بار گھر ٹیلی فون کیا مگر ہر مرتبہ یہی جواب ملتا میم صاحبہ ابھی تک نہیں آئی ہیں۔ وہ دفتر سے اُٹھ گیا۔ گھر پہنچا تو آیا نے ایک لفافہ دیا کہ یہ ایک لڑکا دے گیا ہے۔ وجے نے لفافہ کھولا تو کُسم کا خط تھا۔ لکھا تھا۔

"وجے! میں کل شام سے گھر سے غائب ہوں۔ تم حیران تو بہت ہو گے کہ اچانک میں کہاں چلی گئی۔ ہو سکتا ہے تم کسی ایکسیڈنٹ کے بارے میں غور کر رہے ہو اور پوچھ تاچھ کرتے پھرو تو میں نہیں چاہتی کہ بات کا بتنگڑ بنے یا پھر تمھارے سڑے بھُسے دماغ میں یہ بات آئے کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوں، تو تم تلاش کرتے پھرو اور خواہ مخواہ کا تماشہ بنے۔

وجے! تم سمجھتے ہو کہ سماج پر تمھاری اجارہ داری ہے تم عورت کو اپنی جاگیر سمجھتے ہو۔ تمھارے نزدیک پتنی کا وجود گرم پانی کی تھیلی سے زیادہ نہیں جب ضرورت محسوس ہوئی بدن سینک لیا پھر اٹھا کر پھینکا تو خبر ہی نہیں کہاں پڑی ہے؟

میں تمھیں صرف یہ بات سمجھانا چاہتی ہوں کہ تمھاری طرح میں بھی نہایت آسانی سے اپنی راتیں باہر گزار سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارے درمیان نفرت کے پودے اُگنے لگیں اور پھر ہوس کے کنویں کا پانی پی کر کوئی بھی سیراب نہیں ہوا ہے۔ اس کا پانی جتنا پیو اُتنی ہی پیاس بڑھتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بچائے رکھا اور احساسات کے جہنم میں

جھلستی رہی پھر بھی ہزار کوشش کے باوجود میں تمھارے تنگی دماغ کو مطمئن نہ کرسکی اور اندر ہی اندر جلتی رہی۔

اب جب کہ پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے میں نے ضروری سمجھا کہ میں تمھیں سمجھادوں۔ زمانہ بدل رہا ہے بلکہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ آج کی عورت ہر محاذ پر جنگ کرسکتی ہے۔ اگر مرد پیسے کی ڈور پر کٹھ پتلیاں نچا سکتا ہے تو عورت بھی اپنی ایک مسکراہٹ سے زمانے کو خرید سکتی ہے۔

میں اس شہر سے باہر تفریح کے لیے جارہی ہوں میرے ہمراہ کون ہے؟

میں کب واپس آؤں گی؟

آؤں گی بھی یا نہیں!

اس بارے میں ابھی میں کچھ نہیں لکھ سکتی، تم نے ایک بار میرے اوپر کیچڑ اچھالتے ہوئے کہا تھا، کیا تم اپنی فطرت کے تقاضے اس دوکوڑی کے ماسٹر سے پورے کروگی تاکہ وہ گھٹیا آدمی تمام میں گاتا پھرے!

تمھیں سُن کر خوشی ہوگی اور اگر اس بات پر فخر کرنا چاہو تو فخر بھی کرسکتے ہو کہ میرے ہمراہ کوڑیوں کا نہیں بلکہ کروڑوں کا آدمی ہے، مگر میرا ارادہ اب بھی بھٹکنے کا نہیں ہے۔

ہاں اگر بھٹکی تو اس کی پوری ذمہ داری تم پر جائے گی۔ بچّوں کا خیال رکھنا۔"

کُسُم

درد کی تنہائیاں

ہمارے یہاں سن رائز انٹرنیشنل اسکول کی خاصی شہرت ہے۔ کے جی سے لے کر اے لیول تک کا یہ انگلش میڈیم اسکول اپنا ایک الگ اسٹینڈرڈ رکھتا ہے۔ تقریباً ایک ہزار بچے یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ ڈسپلن کے معاملے میں یہ اسکول بہت سخت ہے۔ ذہین اور محنتی بچے ہی یہاں ٹک پاتے ہیں۔ گلز طوطے یا پھسڈی بچوں کو فیل ہوتے ہی "ٹی سی" دے دی جاتی ہے۔ اسی لحاظ سے ایڈمیشن بھی مشکل سے ہی ملتا ہے۔

اسی اسکول میں داخلہ دلانے کے لیے میں اپنی بیٹی رفی کو لے کر ٹیکسی سے اُترا اور اسکول کے قوانین و ڈسپلن کی مشکلات کے بارے میں غور کرتا ہوا اسکول کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر عمارت تک پہنچا۔ ایک ملازمہ نے پرنسپل کے روم تک میری رہنمائی کر دی دروازے پر "مس اے۔ جے خاں پی ایچ ڈی" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہی اے جے خاں ہیں جن کے رعب اور دبدبے کی شہرت پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں انھیں کی صلاحیت اور اصولوں کی وجہ سے اس اسکول کو ملک بھر میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ میں نے دروازے پہ بیٹھے چپراسی سے اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود اجازت لینے اندر چلا گیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد اس نے واپس آکر مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔

کچھ لمحے تو میں نے توقف کیا اور نفسیاتی طور پر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور دل ہی دل میں آفات و مصیبت ٹالنے والی دعائیں پڑھتا ہوا دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ایک بڑی سی میز پر سر جھکائے ایک صاحبہ لکھنے میں مصروف تھیں۔ کھچڑی بال اور آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ چڑھا ہوا۔

ادھر تو یہ بڑی بی ابھی تک مس ہیں، مس کے ٹائیٹل کی مناسبت سے تو میں سمجھا تھا کہ کسی خونخوار قسم کی جوانی اور شعلہ بار شخصیت سے واسطہ پڑے گا مگر اس چہرے پر تو بلا کی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ لوگوں نے خواہ مخواہ ان کی خوفناکی کے تذکرے مشہور کر کے سب کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ ارے اس چہرے کی معصومیت پر تو غزلیں کہی جاسکتی ہیں بلکہ دیوان کے دیوان تیار ہو سکتے ہیں۔ ان چند ہی لمحوں میں میری گھبراہٹ زائل ہو کر دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی اور اب میں اُن کی خوفناکی کے قصّے بُھلا کر کسی اچھے سے برمحل شعر کے انتخاب کے بارے میں غور کر رہا تھا جو میرے دماغ کے ایکورم میں قید رنگین مچھلیوں کی طرح تیرنے لگے تھے۔ میری بیٹی اپنے ٹھنڈے برف ہاتھ کی مُٹھی میں میری کلائی کو پکڑے کھڑی تھی۔ ماحول پر سکوت طاری تھا کہ ایک جھنکار سُنائی دی۔ جیسے ستار کے خاموش تار مضراب کی زد پر آ گئے ہوں "سِٹ ڈاؤن پلیز" میری بیٹی نے کانپتے ہاتھوں سے کرسی سیدھی کی اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پرنسپل نے اپنا جُھکا ہوا سر اوپر اُٹھایا۔

"ہیو یو اینی مارک شیٹ آر سرٹیفیکیٹ فرام ادر اسکول۔۔۔"

آخری الفاظ اُن کے حلق میں یوں اٹک گئے جیسے کسی خراب کار کا انجن اسٹارٹ ہو کر بند ہو جائے اور وہ حیرت زدہ ہو کر میرا چہرہ تکنے لگیں۔

جیسے بجلی کے ننگے تاروں کو میں نے چھو لیا ہو۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں حیرت و استعجاب کے عمیق سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ مسرت کی تند لہروں نے میری شریان میں سنسناہٹ پیدا کر دی، جیسے بہاروں نے یلغار کر دی ہو، جیسے کلیاں چٹک رہی ہوں اور پھول ہی پھول کھل گئے ہوں۔ جیسے نغمے بکھر گئے ہوں۔ میں حیرت کے سمندر سے نکل کر خوشی کے ساحل پر کھڑا اس وینس کی دیوی کو دیکھ رہا تھا جس کی پیشانی پر ستارہ سحر آج بھی جگ مگ کر رہا تھا۔

پھر کمرے کے سکوت میں میرے دل کی دنیا اُتھل پتھل کر دینے والی اسی پرانی شیریں آواز کا ساز سُنائی دیا۔

"مسٹر سجاد! یہ آپ کی لڑکی ہے؟ کس کلاس میں پڑھتی ہے؟"

بجائے اس کے کہ میں اُن کے سوال کا جواب دوں بے اختیار میرے منہ سے نکلا

"افروز ... یہ تم ہو؟"

"ہاں۔"

"کیا بے مروت بھی ہو گئی ہو؟"

"کیوں؟"

"کیا اس اتفاقیہ ملاقات پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار ممکن نہیں؟"

"کیا یہ ضروری ہے؟"

"جذبوں کی صداقت کی شناخت کے لیے یہ خوشی ہی تو علامت ہے۔"

"مُردہ جذبوں کی تمام علامتیں خود بخود فنا ہو جاتی ہیں۔"

"اچھا... اسی لیے مجھے پہچان کر بھی پہچاننے سے گریز کر رہی ہو۔"

"ایسا تو میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"پھر اس بے اعتنائی کا کیا مطلب ہے؟"

"سجّاد! جن کوچوں کے دروازے بند ہو کر زنگ آلود ہو چکے ہوں ان پر دستک دینے سے کیا فائدہ؟ کام کی بات کرو، وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے اس بچی کے مستقبل کی بات کرو اس کی پڑھائی کی بات کرو۔"

"پڑھائی، پڑھائی آخر جذبوں کی قدر تمھیں کب ہوگی؟"

"سجّاد! یہ جذبے بہت رُلاتے ہیں، میں بہت مشکل سے انھیں سلا پائی ہوں۔ انھیں سوتا ہی رہنے دو۔ خدا کے لیے اس راکھ کو نہ کریدو اگر کوئی چنگاری نکل آئی تو بھڑک بھی سکتی ہے اور اب میرا وجود اتنا مضبوط نہیں رہا کہ میں سہار سکوں۔ ایسا نہ ہو میں خود خاکستر ہو جاؤں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ چنگاری کے وجود کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا جس کو تم نے اپنی انا کی سرد مٹی تلے دبا رکھا ہے۔"

"نہیں سجّاد جذبوں پر مٹی نہیں ڈالی جاتی وقت کی دھول خود بخود انھیں، اسے

اندر چھپا لیتی ہے۔"

"آخر ایسا وقت آئے ہی کیوں اس سے گریز بھی تو کیا جاسکتا ہے۔"

"آنے والا وقت آکر ہی رہتا ہے۔" افروز جہاں نے تلملا کر آنکھیں نکالیں۔ پھر ذرا درشت لہجے میں بولیں "سُنیے... سجاد صاحب میں اس کرسی پر ایک ذمے دار پوسٹ پر بیٹھی ہوں میرا ایک ایک لمحہ اس کے مشن کے لیے وقف ہے۔ میرے فرائض اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں یہاں بیٹھ کر اپنی گزشتہ زندگی کے اوراق اُلٹتی رہوں یا کوئی مجھے میرے ماضی کا آئینہ دکھلا کر میرا وقت ضائع کرتا رہے۔"

کچھ دیر سکوت رہا۔ میں بھی خاموش بُت بنا اُن کی صورت تکتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ قدرے نرم لہجے میں دوبارہ گویا ہوئیں "تم وہی احمق کے احمق رہے کیا میری گفتگو سے تم اندازہ نہیں کرسکے کہ میں اس راکھ کو کریدنا نہیں چاہتی اسی لیے تم سے کام اور صرف کام کی بات کررہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے میرے کاغذات پر نظر ڈالی اور کال بیل کے بزر پر ہاتھ رکھ دیا۔ فوراً ہی اردلی اندر آیا۔

"کلاس ایٹ کی مس کو بلاؤ۔" اردلی سے یہ مختصر سا جملہ کہہ کر وہ اپنے رجسٹر پر جھک گئی جیسے کوئی بچہ اپنے کھلونے میں منہمک ہوجائے اور میں خالی خالی نظروں سے انھیں یوں تکنے لگا جیسے ٹی وی پر پروگرام دیکھتے دیکھتے ڈش کی لائٹ چلی جائے۔

"کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ اس ضدی عورت سے میرا بندھن نہیں بندھا؟" میرے اندر سے ایک آواز اُبھری۔ ہوسکتا ہے ہمارے درمیان تلخیوں کے پودے اُگتے رہتے اور میں اپنی محبت میں گرفتار تمام عمر اس کھیتی کو کاٹتا رہتا۔ دوسرے ہی لمحے جب میں نے اپنی پلکیں جھپکا کر افروز کو دیکھا تو میرے یہ خیالات متزلزل ہونے لگے۔ یہ چہرہ جس کی تابانی سے راہ بھٹکتے مسافر منزل کا پتہ پاجائیں۔ یہ جھیل جیسی گہری آنکھیں جن میں ڈوب کر نکلنے کو جی ہی نہ چاہے۔ یہ فرشتوں جیسی معصومیت سے پُر ایک ملکوتی حُسن تھا جس کی مقناطیسی کشش نے مجھے سودائی بنا رکھا تھا اب جب کہ موسموں کے طویل اثرات سے یہ چہرہ کمھلا گیا تھا، وقت کی کڑی دھوپ نے کُندن سے رنگ کو میلا کردیا تھا پھر بھی یہ بات نہیں تھی کہ نظرانداز کیا

جا سکے۔ میرے ذہن کی پہنائیوں میں تو سابق نقوش کا ہر رنگ محفوظ تھا جو لاشعور کے خزانے سے نکل کر شعور میں مچلنے لگا تھا۔ وقت کی دھول سے اٹا یہ چہرہ آج بھی میری دیوانگی کو آواز دے رہا تھا۔ میں بے خود ہو کر اپنے سامری کو تکتا رہا اور وہ ہر قسم کے جذبات سے عاری سر جھکائے اپنے کام میں منہمک رہی۔ میرا استغراق اس وقت ٹوٹا جب کلاس ایٹ کی مس نے کمرے میں داخل ہو کر افروز سے توجہ چاہی۔

" میڈم! اس لڑکی کا ٹیسٹ لے لیجیے۔" انھوں نے میری بیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ٹیچر سے کہا " ذرا جلدی کیجیے گا یہ بیچارے بہت دیر سے بیٹھے ہیں۔"

جواب میں ٹیچر نے اوکے کہا اور رقی کو اپنے ہمراہ لے کر واپس چلی گئیں۔

ٹیچر کے جانے کے بعد افروز نے میرے چہرے پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اپنے چہرے پہ جھولتی بالوں کی لٹ کو سمیٹتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئیں " آپ یوں بیٹھے بیٹھے بور تو ہو رہے ہوں گے، لیکن کیا کیا جائے ہمارا اصول ہے بغیر ٹیسٹ لیے ایڈمیشن نہیں دے سکتے!"

" ہاں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آپ؟ " میں نے گردن ہلا کر تائید کی " بھلا بغیر ٹیسٹ کے ایڈمیشن کیوں کر ممکن ہے۔" میرے جواب پر انھوں نے بھی اپنی گردن ہلائی گویا مطمئن ہو گئی ہوں۔ پھر وہ دوبارہ بے تعلق ہو کر اپنے کام میں یوں مشغول ہو گئیں جیسے ٹرین کے سفر میں کوئی مسافر اپنے پاس بیٹھے مسافر سے یوں ہی اس کی منزل کا پتہ پوچھے اور پھر لاتعلق ہو کر دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے اور میں ماضی کی ٹرین میں بیٹھا پیچھے بھاگتے ہوئے درختوں کو گننے لگا جن کا سلسلہ دراز تھا۔

" سجاد... تم چار روز سے کہاں تھے؟ کالج کیوں نہیں آئے۔ میں نے تمھیں کتنا تلاش کیا۔ تمھارا پتہ ہی نہیں ہے۔ اب تم پڑھائی سے بہت غفلت برتنے لگے ہو۔ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔" افروز مجھے دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ کر مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

" بتلاتا ہوں، بتلاتا ہوں، ایسی بے چینی کیا ہے، یہ بہت اچھا ہوا تم مل گئیں۔ میں تمھاری ہی تلاش میں ادھر آنکلا تھا۔ چلو کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں وہیں باتیں ہوں گی۔"

کینٹین میں بیٹھتے ہی اُس نے مجھے دوبارہ پُراستفسار نظروں سے دیکھا "جلدی بک چلو تمھیں میری تلاش کیوں تھی؟"

"ارے بھئی چار روز سے یہ آنکھیں دیدار کی پیاسی ہیں انھیں سیراب تو ہونے دو" میں نے قربان ہوجانے والی نظروں سے دیکھا۔

"اُف وہ... پھر حماقت شروع کر دی تم نے؟"

"کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو" میری گنگناہٹ پر ایک دھماکے کی آواز غالب آگئی۔ افروز نے جھلا کر میز پر زور سے گھونسا مارا "میرا پیریڈ شروع ہونے والا ہے کیا اسی مسخرے پن کے لیے تم مجھے یہاں لائے ہو؟"

"نہیں بہت اہم بات کرنی ہے۔"

"تو پھر جلدی منہ سے پھوٹو نا مجنوں پن پر کیوں اتر آئے؟"

"کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

"پھر فضول بکواس!" افروز نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ بکواس نہیں، شروعات ہے، تمہید ہے، اس بات کی جو میں تم سے کہنے جا رہا ہوں۔ یوں سمجھو میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کے لیے سیلف میں چابی گھمائی ہے۔ تمھارا سگنل ملنے کے بعد ایکسی لیٹر پر دباؤ ڈال کر گاڑی آگے بڑھاؤں گا۔"

جواب میں افروز نے اپنا سر پیٹ لیا "بہت فضول بکواس کرتے ہو۔ وقت برباد کرنا کوئی تم سے سیکھے۔"

"سیکھ لینا... وقت برباد کرنا بھی سیکھ لینا۔ آہستہ آہستہ میری صحبت میں سب سیکھ جاؤگی۔ میری بات کا تم نے جواب نہیں دیا۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں؟"

افروز نے زچ ہوکر کہا "تو کیا میں پاگل ہوں جو تمھارے ساتھ خواہ مخواہ گھومتی پھرتی ہوں۔"

"لیکن اقرار نہیں کروگی!"

"اچھا بابا کرلیا اقرار... پھر؟"

"مجھ سے شادی کروگی؟"

"تمھیں آج کیا ہوگیا ہے سجاد! شادی کے بغیر کیا محبت کی تکمیل ممکن ہے۔ جب وقت آئے گا تو شادی بھی ہو جائے گی۔"

"وہ وقت آگیا ہے افروز!" میری آواز گمبھیر ہوگئی۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابو کی طبیعت بہت خراب ہے اُن کے بچنے کی اُمید نہیں ہے۔ اُن کے جگر میں کینسر ہوگیا ہے یہ چار دن میں نے اسپتالوں کے چکر کاٹتے ہوئے گزارے ہیں۔ اُن کی ٹیسٹنگ ہو رہی تھی۔"

"او مائی گاڈ لیور کینسر؟" افروز کی بڑی بڑی آنکھیں ڈبڈبا گئیں "تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے سجاد! آخر تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہیں بتلایا۔ کون سے اسپتال میں ہیں؟ چلو میں ساتھ چلتی ہوں۔ ذرا ٹھہرو، میں اسٹور روم سے اپنا وینٹی بیگ لے لوں۔" اُس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ابو تمھیں یاد کر رہے ہیں۔ ملاقات کر لو تو اچھا ہے مگر بیٹھو تو... ابھی میری بات پوری کہاں ہوئی ہے۔"

اب سب باتیں بعد میں کرنا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا "تم پانچ منٹ انتظار کرو میں ابھی آئی۔"

ابو افروز سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے برعکس ابو کو دیکھ کر افروز کا جو رونا چھوٹا تو ہچکیوں پر دن گئی۔ آخر ابو نے تسلی دی۔ "بیٹی! اتنی محبت کرنے والے جس کے موجود ہوں تو بھلا ان کو چھوڑ کر جانے کو کس کا دل چاہے گا۔ تم فکر مت کرو انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

دوسرے دن افروز نے خود ہی مجھے تلاش کر لیا "اب ابو کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بس ویسی ہی ہے، افروز! کل میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ تمھارے پاس

وقت ہو تو میری بات سنجیدگی سے سُن لو۔"

افروز نے میرے اُترے ہوئے چہرے پہ نظر ڈالی" ایسی کیا بات ہے جس کے لیے تم جیسا غیر سنجیدہ آدمی سنجیدہ ہو گیا ہے۔"

"سنو! ڈاکٹروں کا کہنا ہے اب ابو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے مہمان ہیں کینسر جگر میں پھیل گیا ہے گو کہ میں نے انھیں بتلایا نہیں ہے لیکن وہ سب محسوس کر رہے ہیں انھوں نے مجھ سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا ہے۔ جانتی ہو وہ کیا ہے؟"

"کیا ہے؟" افروز نے مجھ سے ہی استفسار کیا۔

"وہ چاہتے ہیں میں اُن کی زندگی میں ہی اپنا گھر بسا لوں۔ اس سلسلے میں تمھارا جواب چاہتا ہوں۔"

"نہیں سجاد، یہ کیوں کر ممکن ہے ابھی میں نے شادی کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔" افروز پریشان ہو گئی" ابھی تو مجھے ایم اے کرنا ہے اور پھر آگے بھی پڑھنا ہے۔"

"دو چار روز میں سوچ سمجھ لو۔" میں نے پیار سے سمجھایا۔

"دو چار روز میں...؟" افروز کی چیخ نکل گئی" کم از کم چار پانچ سال تو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"ارادہ کرنے سے ہوتا ہے۔ شادی تمھاری پڑھائی میں حارج نہیں ہو گی مجھے معلوم ہے تمھیں پڑھنے کا جنون ہے۔ تم شوق سے اپنا جنون پورا کرتی رہنا۔"

"اور بچے بھی پیدا کرتی رہنا۔" افروز نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا، نا بابا... ابھی یہ ناممکن ہے۔"

"افروز! میری بات کو سمجھو کیا تم چاہتی ہو ابو میری ناخلفی کی خلش لے کر اس دنیا سے جائیں اور جب وہ رخصت ہو رہے ہوں تو ان کی آنکھیں حسرت و یاس کے کرب میں مبتلا ہوں، نہیں افروز یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے جب میں بہت چھوٹا تھا تو امی ہم سے رخصت ہو گئی تھیں۔ میری خاطر ابو نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ میری ذرا ذرا سی خوشی کا دھیان رکھا۔ اب ان کے آخر وقت میں

انھیں دُکھ دینے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

"دیکھو سجاد یہ تمھارا مسئلہ ہے میں اس بارے میں تم سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"کیوں... کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

"کرتی ہوں اور بیحد کرتی ہوں لیکن میری محبت صرف جنون نہیں ہے میں ہر معاملے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی بھی عادی ہوں۔" بات کرتے کرتے کسی خیال کے تحت اچانک افروز کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ مسکرا کر بولی "اچھا ایسا کرو ہم منگنی کیے لیتے ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ابو کو تو معلوم ہی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"تب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے انھیں معلوم ہے آج نہیں تو کل میری تمھاری شادی ہو ہی جائے گی۔" افروز نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر کب؟ دیکھو افروز ابو اس بات سے پریشان ہیں کہ ان کے بعد میں اس دنیا میں تنہا رہ جاؤں گا۔ ان کی خواہش ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی میرے گھر بار کا کوئی سہارا ہو جائے، تم ہی بتلاؤ ایسے حالات میں جب کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اپنی سوچ میں کیا وہ حق بجانب نہیں ہیں۔ کیا صرف منگنی سے ان کی تشفی ہو سکتی ہے؟"

"کیا ممکن ہے اور کیا نہیں سجاد میں نہیں جانتی ہاں یہ میں ضرور جانتی ہوں کہ میری منزل تم ہو البتہ مجھے بہت آگے جانا ہے۔ اس راہ میں اگر میں کسی پڑاؤ پر ٹک گئی تو اندیشہ ہے کہ تھک کر بیٹھی ہی نہ رہ جاؤں۔ اسی لیے میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جو میری سمت موڑ دے۔"

"اچھا تم دو چار دن اور سوچ سمجھ لو۔" میں نے التجا کی۔

"سجاد سوچنا سمجھنا تمھیں ہے میں جو فیصلہ کر لیتی ہوں اس میں سوچنے سمجھنے کی گنجائش نہیں رہتی۔"

پھر جب میں نے ابو کو افروز کے فیصلے سے آگاہ کیا تو ان کے چہرے پہ دنیا جہان کی ویرانی چھا گئی۔ یاسیت کا سیلاب ان کی آنکھوں میں اُمنڈ آیا اور اپنی اس

تمنا کے لیے خوشیوں کے جو موتی انھوں نے بچا کر رکھے تھے وہ سیلاب کی زد میں آکر بکھرنے لگے میں ان موتیوں کو روکنے آگے بڑھا " ابو... آپ تو کبھی نہیں روتے آج یہ آپ کیا کر رہے ہیں محبت تو میں نے کی ہے اور رو آپ رہے ہیں۔ کیا آپ اندازہ نہیں لگا سکے کہ افروز ایک سیلفش لڑکی ہے۔"

" ہاں بیٹے اس کی باتوں میں خود غرضی کی بُو تو ہے، پر میں یہ سوچ رہا ہوں کیا کیا جائے کسی اور جگہ شادی کا مطلب یہ نہ ہو کہ تمھاری زندگی ہی اجیرن ہو جائے اور تم بجھ کر رہ جاؤ میں تمھیں ہمیشہ ہنستا کھیلتا اور شاداب و شگفتہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ لڑکی تو چار پانچ سال کی بات کر رہی ہے۔ بھلا میرے بعد تمھاری تنہا زندگی اتنی مدت تک کیسے کٹے گی میں تمھیں یوں ہی چھوڑ کر چلا جاؤں اس تصور سے ہی میرا دم گھٹتا ہے۔ ایسے میں تو میری جان بھی آسانی سے نہیں نکلے گی۔"

" ابو آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی آنکھوں میں دُکھ کے سائے نہیں دیکھ سکتا آپ کو خوش دیکھنا ہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔ افروز مجھے اپنے مقصد کے لیے نظر انداز کر سکتی ہے تو کیا میں اس کو بھلا نہیں سکتا۔ آپ غم نہ کریں جیسا آپ چاہیں گے وہی ہوگا۔"

اور پھر صنوبر سے شادی کے بعد میں خوش نہیں رہ سکا۔ صنوبر ایک اچھی بیوی ثابت نہیں ہو سکی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا خود غرضی کیا چیز ہوتی ہے۔ کاش میں انتظار کر لیتا۔ کاش ابو مجھ سے اتنی شفقت نہ کرتے کاش...

میرے خیالات کا سلسلہ ایکدم منقطع ہو گیا، کمرے کا دروازہ کھلا اور کلاس ٹیچر میری بیٹی کے ساتھ اندر آگئیں۔ انھوں نے ٹیسٹ کی رپورٹ افروز جہاں کے آگے بڑھا دی۔ افروز نے رپورٹ چیک کی اور تحسین آمیز نظر ننھی پر ڈالی۔ پھر مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوئیں " سجاد صاحب آپ کی بیٹی تو بہت لائق ہے کیا آپ ایڈمیشن اور فیس کی رقم ساتھ لائے ہیں؟"

جواب میں میری اثبات میں گردن ہلتی دیکھ کر انھوں نے ٹیچر سے کہا " میڈم! آپ ان کا واؤچر بنا دیجیے اور پلیز ذرا کیشیئر کا روم بھی دکھلا دیں۔"

میری بیٹی کو سن رائز اسکول میں ایڈمیشن مل گیا لیکن میرے دل پر اداسی کی گھٹائیں

چھا گئیں۔ رنج و الم کا ساگر بپھر کر میرے احساس پر ٹہو کے مارنے لگا اور میں ضبط و تحمل کی چٹانوں کی اوٹ میں خود کو چھپائے کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔

کوئی ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ رفی نے بتلایا۔ ابو ہماری پرنسپل بہت بیمار ہیں وہ اسکول نہیں آرہی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کسی نرسنگ ہوم میں بھرتی ہیں۔"

"کیا ہوا ہے انھیں؟" میں نے گھبرا کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"معلوم نہیں۔"

"کون سے نرسنگ ہوم میں داخل ہیں؟"

"پتہ نہیں" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اچھا تم اپنی مس سے کل ذرا نرسنگ ہوم کا نام پتہ تو معلوم کرنا۔ اُن سے کہنا ہمارے ابو ان کو دیکھنے جائیں گے۔"

دوسرے دن شام کو جب میں افروز کو دیکھنے نرسنگ ہوم پہنچا تو کمرے کے باہر برآمدے میں ہی افروز کی پھوپھی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونکیں اور ایسے گھبرائیں گویا ان کے سامنے کوئی بھوت پریت آگیا ہو۔ بجائے اس کے کہ وہ مدتوں بعد کی اس ملاقات پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار کرتیں نہایت روکھے لہجے میں بولیں "سجاد میاں... تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔"

"وہ... وہ میری بیٹی نے افروز جہاں کے اسکول میں داخلہ لیا ہے اسی نے مجھے بتلایا تھا۔"

"اوہو... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم افروز جہاں سے مل چکے ہو۔" انھوں نے پُرتشویش انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

میں نے اثبات میں اپنی گردن کو جنبش دی۔

"یہ اچھا نہیں ہوا سجاد! بڑی مشکل سے وہ تمھیں بھلا پائی تھی۔ تم سے مل کر اس کے زخم پھر ہرے ہوگئے۔ یہی وجہ ہے وہ آج کئی روز سے گم صُم تھی اور آخر کار اس کو دورے پڑنا شروع ہوگئے۔"

"میں قطعی نہیں سمجھا کس قسم کے دورے؟" میں نے حیرت سے ان کا چہرا دیکھا۔

انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔" ہاں تم کیا سمجھو گے تم تو شادی کر کے آرام سے بیٹھ گئے اور وہ جی کا روگ لگا بیٹھی۔"

" مگر اس نے شادی کیوں نہیں کی؟ اس سے تو کوئی بھی شادی کر سکتا تھا۔ نہایت خوبصورت، اسمارٹ اور ذہین ترین لڑکی تھی وہ۔"

" اسی ذہانت نے تو اس کو ڈبو دیا۔ اس نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وقت کی قدر ہی نہیں کی اور ڈگریوں پر ڈگریاں لیتی رہی۔ بھلا وقت کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ جب ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی، اور وہ بھی ایک ضدی ہے۔ اس نے تعلیمی معیار میں ہمیشہ اپنا ہم پلہ ہی چاہا پیسے کی تو اس نے پرواہ نہیں کی لیکن چوں کہ تم سے چوٹ کھا چکی تھی تو چاہتی تھی کہ لڑکا کم از کم تمھاری طرح اسمارٹ اور ہینڈسم ضرور ہو تا کہ اس کی پرانی خلش کا کسی حد تک مداوا ہو جائے۔ بھلا جب وقت ہی ڈھل گیا تو یہ سب خوبیاں اب کہاں یکجا ملتیں۔ جانتے ہو اس نے اپنے تعلیمی جنون میں کہاں کہاں سے ڈگریاں اکٹھی کر رکھی ہیں؟"

میں ہونق بنا ان کا چہرہ تک رہا تھا۔ میں بھلا کیا جواب دیتا بس ٹکر ٹکر ان کی صورت دیکھتا رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ خود ہی بھولیں" مجھ جاہل کو تو اتنے نام بھی نہیں آتے۔ بس یوں سمجھو لندن، ہالینڈ، جرمنی سب اس نے چھان مارے۔ ماری گئی ڈھیروں ڈگریوں کا پلندہ اس کے پاس ہے مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" میں نے خاموش نگاہوں سے انھیں دیکھا۔

"تم تو جانتے ہی ہو عورت کا وجود مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کا گھر نہ بس جائے، ماں بننے کی تمنا ایک فطری تمنا ہے اور جس بدقسمت کی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی اس کا وجود کسی برق رسیدہ نخل سے زیادہ بہتر نہیں رہتا وہ اپنے اندر سے جھلس کر رہ جاتی ہے۔ یاسیت اس کے دل و دماغ کو جکڑ لیتی ہے اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں افروز جہاں بھی فرسٹریشن میں مبتلا ہے۔ بیٹے وہ ٹرنکولائزر پر جی رہی ہے اب کئی سال سے اچھی بھلی ہو گئی تھی دوائیں بھی چھوٹ گئی تھیں لیکن تم سے ملاقات کے بعد اس کے زخموں کا کھرنڈ ادھڑ گیا اور ناسور

پھر سنے لگا۔ بیٹے! تم ایک کام کرو تو ہم پر بہت احسان ہو، تم افروز جہاں سے مت ملو بلکہ اپنی لڑکی کو بھی اسکول سے اُٹھالو اور اگر ہوسکے تو یہ شہر ہی چھوڑ دو۔"

"آپ بے فکر رہیے۔ میں افروز کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے واپس آ گیا۔

دوسرے دن میں اسکول میں ہیڈ مسٹریس سے کہہ رہا تھا "میری بیٹی کے لیے ٹی سی چاہیے۔"

انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا "آپ کو ہم سے کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا بات ہے آپ کی بچی تو بہت ذہین ہے۔ ہمارے اسکول میں پڑھ کر اس کا مستقبل زیادہ روشن ہوسکتا ہے اور پھر آپ نے ابھی کافی روپیہ خرچ کیا ہے۔"

دراصل میں یہ شہر چھوڑ کر اپنے آبائی وطن جا رہا ہوں وہیں سکونت اختیار کروں گا اگر ممکن ہو تو ابھی ٹی سی بنا دیں۔"

"بغیر پرنسپل کے دستخط کے تو ناممکن ہے اور وہ بیمار ہیں آپ کو کچھ دن انتظار کرنا ہوگا۔"

"نہیں میں انتظار نہیں کرسکتا، آپ ایسا کریں اس کا نام خارج کر دیں کل سے وہ اسکول نہیں آسکے گی۔" جواب میں انھوں نے کیا کہا یہ سُننے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں سے واپس آ گیا۔

روشن دان

راجن نے سر اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ پورے آسمان کو بادلوں نے ڈھانک رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جلد ہی بارش ہونے والی ہے۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی نکال کر سلگائی۔ ابھی وہ اس کا دوسرا ہی کش کھینچ پایا تھا کہ دور سے پولیس کی سیٹی کی آواز آئی۔ اُس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ دو سپاہی ڈنڈے ہاتھ میں لیے وسل بجاتے چلے آرہے تھے۔ راجن نے فوراً ہی بیڑی کا جلتا ہوا سرا فٹ پاتھ کی دیوار سے مسل کر بُجھا دیا اور خود لپک کر نزدیک کی گلی میں داخل ہوگیا۔

جب دونوں گارڈ باتیں کرتے آگے نکل گئے تو وہ پھر کھلی سڑک پر آگیا۔ جس بنگلے پر اسے کارروائی کرنا تھی وہ کافی دور تھا۔ ذہن میں بنگلے کا نقشہ جمائے ہوئے وہ آگے بڑھتا گیا اور جب وہ بنگلے پر پہنچا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ فوراً ہی بنگلے کے عقب میں جا پہنچا اور پانی کی نکاسی کے پائپ کو پکڑ کر وہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔

اس نے چاروں طرف گھوم کر چھت کا چکر لگایا وہ کسی کمرے میں داخل ہونے کے لیے کسی مناسب سی کھڑکی یا روشندان کی تلاش میں تھا کہ اس کی نظر ایک روشندان پر پڑی جس کے شیشوں میں نیلی، پیلی اور سرخ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے شیشہ اُٹھا کر اندر جھانکا۔ سامنے ہی ایک بڑا سا ٹیلی ویژن سیٹ رکھا تھا۔ اس کے اسکرین پر نہایت روشن رنگین تصویریں متحرک تھیں۔

راجن پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ننگ دھڑنگ

میم کو دیکھنے لگا جو اپنے کتّے سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی ابھی راجن کی حیرانگی کم نہ ہوئی تھی اور وہ بغیر پلکیں جھپکائے ٹیلی ویژن کے اسکرین کو تکے جارہا تھا کہ کتّے نے ہانپنا شروع کر دیا میم نے کتّے کو تھپ تھپایا اور خود چوپایہ بنتے ہوئے کتّے سے کم آن ڈارلنگ کہا۔ میم کی آواز سُنتے ہی سدھے ہوئے کتّے نے کسی چابی والے کھلونے کی طرح اپنی مالکن کے اشارے پر کھیلنا شروع کر دیا۔

حیرت، کراہیت اور شرم کے ملے جُلے احساسات سے راجن حواس باختہ ہوگیا۔ اس نے گھبرا کر ٹیلی ویژن پر سے اپنی نگاہیں ہٹالیں۔ چند ثانیہ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آنکھ کھولی تو ٹیلی ویژن بدستور متحرک تھا دبی دبی سسکاریوں اور ہلکی ہلکی غرّاہٹوں کا آہنگ کمرے میں پھیل رہا تھا۔

راجن سے مزید نہ دیکھا گیا اس نے وہاں سے نگاہ ہٹا کر کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

پورے کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی لیکن ٹیلی ویژن کی روشنی کا انعکاس اس کمرے کو نیم روشن کیے ہوئے تھا۔ کمرہ خاصہ بڑا تھا۔ زمین پر پھولدار قالین فرش کیا ہوا تھا۔ دیوار کی جانب ایک صوفہ رکھا تھا اور اس کے سامنے ہی ایک مسہری تھی جس پر تکیوں سے ٹیک لگائے سیٹھ اور ان کی بیتنی ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔

راجن نے چور نگاہوں سے ٹیلی ویژن کی جانب دیکھا۔ آہستہ آہستہ اس کی شرم ٹوٹتی جارہی تھی۔ پھر وہ بڑی دلچسپی سے کھیل دیکھنے میں محو ہوگیا۔

کھیل ختم ہوا تو فوراً ہی دوسرا تماشہ شروع ہوگیا۔ اب سامنے ایک موجیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ اس میں کچھ انگریز عورتیں اور مرد نہا رہے تھے اور جب وہ پانی سے باہر نکلے تو غول کا غول ننگ دھڑنگ تھا۔ قہقہے لگاتے۔ چیخ وپکار کرتے وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے ایک ایسے کھیل کا نظارہ تھا جس کو غول بنا کر جانور بھی عمل میں نہیں لاتے طرح طرح کے سُریلے قہقہے سیٹیاں سسکاریوں کا ملا جُلا شور ایک ہنگامہ ہو رہا تھا اور دور و نزدیک کے قسم قسم کے پوز اسکرین پر آجارہے تھے۔ راجن بُت بنا وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا

اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور پلکوں نے جھپکنا بند کر دیا تھا۔

تماشہ چل ہی رہا تھا کہ اس کی نگاہیں گھومیں۔ اب سیٹھ نے اپنی پتنی کی جانب کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ پھر پتنی کے اشارے پر سیٹھ نے ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آف کر دیا کمرے میں ناچتی ہوئی رنگین روشنیاں یکلخت معدوم ہوگئیں اور ان کی جگہ ہلکے نیلے بلب کی روشنی نے لے لی۔ اصل تماشہ بند ہو چکا تھا اور اس جیتے جاگتے تماشے میں راجن نے دلچسپی نہیں لی۔ اس نے روشن دان کا شیشہ نیچے کیا اور سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ صبح کے آثار پیدا ہو چکے تھے وہ چپ چاپ نیچے جانے والے پائپ کی جانب بڑھا اور پھسلتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ آن کی آن میں وہ بنگلے کے باہر تھا۔

راجن جب گھر پہنچا تو صبح ہو رہی تھی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اس نے منہ سر لپیٹا اور پڑ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے دماغ میں ٹیلی ویژن کا اسکرین روشن ہو گیا اور پھر اس کتے نے اپنا کرتب دکھلانا شروع کر دیے اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن کب تک۔ اسے جیسے ہی غنودگی آتی ٹیلی ویژن کا اسکرین اس کے دماغ میں روشن ہو جاتا اور وہ آنکھیں کھول دیتا۔ اسی بے چینی میں دوپہر ہوگئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

رات کو دھندے کے لیے وہ جب گھر سے نکلا تو غیر ارادی طور پر اس کے قدم سیٹھ ہری رام کے بنگلے کی جانب ہی اٹھ گئے۔ اب بنگلے کے ماحول کے لیے وہ اجنبی تو رہا نہیں تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھت پر تھا اور بلی کی طرح بے آواز چلتا ہوا وہ اسی روشندان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جس کے شیشے پر آج بھی بنفشی روشنیاں تھرتھرا رہی تھیں۔ اس نے بڑے چاؤ سے روشندان کا شیشہ ہٹایا تو سامنے وہی روشن اسکرین تھا۔ جہاں چار انگریز لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ راجن بڑی دلچسپی سے اُن کے نیم عریاں جسم کو تک رہا تھا کہ انھوں نے تماشہ شروع کر دیا۔ راجن کو وہ معصوم چڑیاں یاد آگئیں جو اس کے آنگن کی منڈیر پر آپس میں کھیلا کرتی تھیں۔ بغیر چڑے کے اس چڑی چڑے کے کھیل نے راجن کو ایک بار پھر دریائے حیرت میں غرق کر دیا اور بغیر پلکیں جھپکائے نہ جانے کب

تک اس کھیل کو دیکھتا رہا کہ سین بدل گیا۔ اور اب ایک مرد اور دو عورتیں باتیں کرتے نظر آتے۔ انگلش میں وہ کیا کہہ رہے تھے راجن سمجھ نہیں سکا اور جب اُن کا کھیل شروع ہوا تو راجن کی طبیعت متلانے لگی۔ منہ کا یہ استعمال اس کے تصور سے باہر تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنا جھکا ہوا سر روشندان سے ہٹا لیا اور آسمان کو دیکھنے لگا جہاں سفید بادلوں کے پرے ہوا کے دوش پر ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔ چند ہی لمحے گذرے ہوں گے کہ طبیعت نے اُکسایا اور وہ پھر بے اختیاری طور پر روشندان پر جھک کر تماشہ دیکھنے میں محو ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں راجن نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے اور سانس تیز چلنے لگی ہے۔ پھر اس کا سر چکرایا اور جی متلانے لگا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا اس نے گھبرا کر روشندان کا شیشہ بند کر دیا پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اڑ اڑڑ کرتے ہوئے اس کی ساری غذا منہ کی راہ نکل گئی۔ اب وہ چھت پر چت پڑا ہانپ رہا تھا لیکن طبیعت کی مالش کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے روشندان کے شیشے پر ناچتے ہوئے رنگین جھماکوں کو نفرت سے دیکھا اور خاموشی سے اس پائپ کی جانب بڑھ گیا جس کے سہارے سے اسے نیچے اُترنا تھا۔

جیسے تیسے کر کے راجن گھر پہنچا۔ دماغ میں سخت ہیجان تھا۔ اس نے چپ چاپ کھاٹ پر دری بچھائی اور لیٹ گیا۔ معلوم ہوتا تھا بدن تپ رہا ہے اور کان ٹھنک رہے ہیں۔ سانس کی آمد و رفت بے ترتیب ہو گئی تھی۔ ناک کی راہ سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں ٹیلی ویژن کا تماشہ پھنس کر رہ گیا تھا وہ مسلسل چھت کو تکے جا رہا تھا اور دماغ کے پردے پر ٹیلی ویژن کی رنگین تصویریں رقصاں تھیں۔ اسے کسی کل چین نہیں آ رہا تھا کب دوپہر ہوئی اور کب سہ پہر اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔

وہ تو جب چونکا جب کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا دیکھا تو اس کا دوست شنکر تھا۔ شنکر اس کا دوست بھی تھا اور ہم پیشہ بھی کبھی کبھی دونوں ساتھ مل کر

تھے، چوری کرنے جاتے تھے۔

شنکر نے آتے ہی سوال کیا" ارے ابھی تک پڑا ہوا ہے۔ کیا رات پٹائی ہوگئی۔ پکڑا گیا تھا کیا...؟"

راجن نے شنکر کی بات سُنی اور نہایت مسکین سی صورت بنا کر رہ گیا۔

شنکر نے اپنا سوال پھر دہرایا"بول نا کیا بات ہے چپ کیوں ہے؟"

راجن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور نہایت مری ہوئی آواز میں بولا۔ " شنکر مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں پھُنکا جا رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے میرا دم نکل جائے گا۔"

شنکر برجستہ بولا" کیا کھا گیا ہے تو... ابے کُشتہ وشتہ تو نہیں کھالیا؟"

" قسم لے لو صبح سے کھیل کا دانہ بھی اُڑ کر میرے منہ تک نہیں گیا ہے۔"

" پھر کیا بات ہے کیوں مر رہا ہے تو؟"

" وہ... وہ کل رات میں نے فلم دیکھی تھی۔"

" ابے کون سی فلم دیکھ ڈالی۔ دلیپ کمار کی یا راجکمار کی۔"

" نہیں نہیں دلیپ کمار اور راجکمار کی فلمیں تو پاک صاف ہوتی ہیں۔ میں نے تو نہایت ننگی فلم دیکھی ہے جس میں سب کچھ دکھلایا گیا ہے۔"

شنکر نے قہقہہ لگایا اور بولا" ابے سالے معلوم پڑتا ہے تو نے بلو فلم دیکھ لی ہے" پھر اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا" بتلا یار کہاں ہاتھ مارا؟"

راجن نے دو روز کی رام کہانی شنکر کو سُنائی تو شنکر نے پھر ایک زبردست قہقہہ لگایا اور راجن کی ران پر ایک ہاتھ جماتا ہوا بولا" تو تو اس لیے پھُنک رہا ہے خیر جانے دے فکر نہ کر میں علاج کرا دوں گا آج رات چمپا کے یہاں چلیں گے۔"

راجن نے فوراً ہی گھبرا کر کہا" نہیں نہیں تو تو جانتا ہے میں ان چکروں میں نہیں ہوں۔"

" تب تو ایک کام کر زیادہ سے زیادہ پانی پی اور ٹھنڈائی کھا ٹھیک ہو جائے گا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر شنکر نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا "یار راجن، کیا تو مجھے فلم نہیں دکھلائے گا مجھے بھی لے چل وہاں۔"

راجن نے جواب دیا "نہیں ابھی نہیں۔ ابھی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ کچھ دن جانے دے تو لے چلوں گا۔"

چار دن گزرے ہوں گے کہ شنکر آدھمکا اور راجن سے بولا "چل آج سیٹھ ہری رام کے بنگلے پر چلتے ہیں۔"

سیٹھ ہری رام کے بنگلے کے پاس پہنچ کر راجن نے سن گن لی اور پلک جھپکتے ہی دونوں کمپاؤنڈ کے اندر تھے۔ پھر چھت پر پہنچنے میں انھیں زیادہ دیر نہیں لگی۔

لیکن آج روشندان پر سے رنگین جھماکے غائب تھے ان کی جگہ دودھیا روشنی نے لے لی تھی۔

راجن نے شیشہ اٹھایا تو سامنے سیٹھ صاحب اپنے بہی کھاتے پھیلائے بیٹھے تھے اور ان کی بیوی بستر پر لیٹی خراٹے لے رہی تھیں۔

راجن نے اپنے سر کو باہر کھینچا اور مایوس نگاہی سے شنکر کو دیکھا۔

پھر دونوں نے پروگرام بنایا جب آہی گئے ہیں تو کچھ ہاتھ مارتے چلیں۔ راجن گھوم کر بنگلے کی پشت پر پہنچا۔ ایک روشندان میں اسے روشنی نظر آئی اس نے آگے بڑھ کر شیشہ اٹھایا تو وہیں جم کر رہ گیا۔ پیچھے سے شنکر کی آواز آئی "ابے کیا ہوا کیا بات ہے؟"

"بات بتلانے کی ہوتی تو وہ بتلاتا اندر دو جیتی جاگتی لڑکیاں ٹیلی ویژن والی فلم کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور ان کی میٹھی میٹھی سسکاریوں اور نرم نرم کراہوں کے اتار چڑھاؤ سے ایک ہیجان انگیز آہنگ پیدا ہو رہا تھا۔ راجن سنتا رہا اور دیکھتا رہا اس کے ساتھ ساتھ اس کی سانس کی رفتار بھی بڑھتی رہی۔

پیچھے بیٹھے ہوئے شنکر نے اسے ایک ٹہوکا دیا "اندر کیا ہو رہا ہے بے! ذرا میں بھی تو دیکھوں۔"

مگر راجن جو کہ مسحور ہو گیا تھا شنکر کی بات سن ہی نہیں سکا۔ اس کی پھیلی ہوئی نگاہیں اندر کمرے میں جمی ہوئی تھیں اور کان نشیلے سرگرم میں کھوئے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم میں طوفانی لہریں اُٹھنے لگیں اور اس کے پٹھے اینٹھنے لگے۔ پھر اس کی سانس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی اور جیسے ہی شنکر نے راجن کو سامنے سے ہٹانے کے لیے اس کے جسم کو تھپتھپایا راجن کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح پلٹ کر شنکر سے لپٹ گیا اور اس نے اپنے دانت شنکر کے بازو میں پیوست کر دیے۔

شنکر ارے ارے کرتا ہی رہ گیا۔ لیکن شکنجے کا دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ شنکر کو اپنی پسلیاں چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"ابے یہ کیا کر رہا ہے۔ ابے چھوڑ میں مرا" شنکر لاکھ کہتا رہا لیکن راجن کے جنون میں کمی نہیں ہوئی۔ اس نے گھبرا کر راجن کے چہرے کو دیکھا۔ لال بھبھوکا چہرہ، آنکھیں سرخ، اور چڑھی ہوئیں۔ نہ جانے کون سی حیوانی طاقت سے وہ شنکر کو بھینچ رہا تھا حالاں کہ شنکر راجن سے کہیں زیادہ طاقت ور اور مضبوط تھا لیکن اس وقت وہ خود کو قطعی بے بس پا رہا تھا۔

پھر جیسے ہی اُمنڈتے ہوئے جوار نے بھاٹے کی جانب اپنا رُخ موڑا۔ راجن کی گرفت بھی آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگی۔ ڈھیل کو محسوس کرتے ہی شنکر تڑپ کر راجن کی گرفت سے نکل گیا اور اس نے خجالت آمیز غصہ بھری نظروں سے راجن کی جانب دیکھا جو زمین پر اوندھا پڑا دھیرے دھیرے ہانپ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کی خفت کا احساس شنکر کو ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک راجن کو یہ ہو کیا گیا۔

تب ہی اس کا خیال روشندان کی جانب گیا اور اس نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر روشن دان کا شیشہ اُوپر اُٹھایا لیکن وہاں اب تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

شانتی بے خبر سو رہی تھی کہ سامنے دیوار پر لگا کال بیل کا بزر کسی کی آمد کا اعلان کرنے لگا، تو اس نے کسمسا کر ایک انگڑائی لی اور پھر دوسری جانب کروٹ بدل لی۔ حالاں کہ وہ بیدار ہو چکی تھی اور بار بار باہر سے بجنے والی کال بیل کی آواز صاف سُن رہی تھی۔ دراصل اب اسے مزید کسی گاہک کی خواہش نہیں تھی

رمیش جب بھی اس کے ساتھ رات گزارتا پھر اس رات کیا وہ دوسرے دن بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی تھی؛ پچھلی بار جب رمیش اُس کے پاس تین دن اور تین راتیں گزار کر گیا تھا تو ایک ہفتے تک اُس نے چھٹی منائی تھی۔

ہری چند دلال بھی اس کے اس دیوانے پن پر حیران تھا، اُس نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھو شانتی دھندے سے کھلواڑ مت کرو، سمئے کی قدر کرو، سمئے بیت گیا اور جوبن ڈھل گیا تو ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔ پھر لاکھ بناؤ سنگھار کرو کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا اس بازار میں ناری کا مول نہیں ہے جوانی کا مول ہے، بھگوان کے آشرم میں بھی جوان کنیاؤں کی ہی قدر ہوتی ہے۔ اگر تمھارے بھاگ میں بھگوان نے یہی دھندہ لکھ دیا ہے تو اس سے کھلواڑ نہ کرو، من لگا کر کچھ سال گزار لو تو کم از کم ایک فلیٹ تو خرید لوگی۔ اور اپنا فلیٹ بعد میں بہت کام آوے گا۔

شانتی مسکرا کر جواب دیتی " ارے ہری کا کا من بھی تو کوئی چیز ہے؛ من کے لیے منُش کیا کیا نہیں کرتا۔ سچی بات تو یہ ہے کا کا رمیش کے بعد مجھے دوسرے مرد کے منہ کی باس تک اچھی نہیں لگتی۔ جی میں آتا ہے سالے کے منہ پر تھوک کر بھاگ جاؤں۔"

ہری چند نے اپنی بیڑی کو دیا سلائی کا شعلہ دکھلاتے ہوئے کہا "تو اسی کو رکھ لے۔ روز کا خرچہ پانی اسی سے لے لیا کر۔"

"ہائے کاکا اسی بات کا تو دُکھ ہے۔ وہ تو بس سانڈ ہے سانڈ۔ اگر کھرچہ دینے کے قابل ہوتا تو بات ہی کیا تھی، وہ تو ہم سے ہی اُلٹا اپنا کھرچہ لے جاتا ہے۔"

اب چڑیا کی کوک مسلسل سُنائی دے رہی تھی۔ کوئی کال بیل کا بٹن برابر دبائے جارہا تھا۔

شانتی نے آنکھیں کھول دیں اور کھسیا کر دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ یہ رات کو ایک بجے نہ جانے کون سُور کا بچّہ آیا ہے، دو گھڑی چین نہیں لینے دیتے معلوم ہوتا ہے میں ان کی کھریدی ہوئی ہوں۔

پھر شانتی نے بستر سے اُٹھتے اُٹھتے پیچھے مڑ کر دیکھا تو رمیش دوسری طرف منہ کیے سو رہا تھا۔ اُس نے رمیش کو جھنجوڑتے ہوئے کہا "بابو، اُٹھو اور دوسرے کمرے میں چلے جاؤ باہر کوئی آیا ہے۔ میں دروا جا کھولنے جارہی ہوں۔"

رمیش ہڑبڑا کر یوں اُٹھ کھڑا ہوا، جیسے گلی میں سوتے ہوئے کتّے کو کوئی بچہ اینٹ مار دے تو وہ اُچھل کر بھاگتا ہے۔ رمیش نے بھی لپک کر اپنی شرٹ اُٹھائی اور بٹن لگاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"نمسکار شانتی جی!" ہری چند نے اپنی مخصوص، تیکھی اور مٹھاس بھری آواز میں شانتی کو ایک لمبا نمسکار کیا۔ جس میں پوشیدہ لہجے کے زہریلے پن کو شانتی نے صاف محسوس کیا گویا کہہ رہا ہو کیا خود کو دان پُن میں ہی صَرف کر دو گی یا ہمارے کمیشن کا بھی کچھ خیال ہے؟

شانتی نے بہت تیکھے انداز میں سوال کیا "کا ہے ہری کاکا؟"

ہری چند لپک کر کمرے کے اندر آ گیا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں آہستگی سے یوں بولا جیسے کسی بچّی کو اسکول جانے کے لیے پھسلایا جارہا ہو۔ شانتی جی یہ بابو اپنے شہر کا نہیں ہے۔ باہر کا بیوپاری سیٹھ ہے۔ کانپور کا رہنے والا، بڑی مشکل سے پھانس کر لایا ہوں۔

وہ بدیسی شراب کی بوتل بھی ساتھ لایا ہے۔ میں نے بھی دو گنے پیسوں کا سودا طے کیا ہے تم جلدی سے سنگھار کرو۔ میں تب تک اس کو ادھر بٹھاتا ہوں۔"

"نہیں کاکا آج من نہیں کرتا" گویا اسکول کی لڑکی نے بستہ پھینک کر ضد کرتے ہوئے جھنجلاہٹ ظاہر کی۔

"اری پاگل میں پیسے نقد گن چکا ہوں، اور پھر تو تو کل تک کڑکی کا رونا رو رہی تھی۔ جا بھاگ جلدی تیار ہو۔ وہ باہر کھڑا ہے بُرا مان جائے گا۔ میں اس کو بلاتا ہوں" یہ کہتے ہوئے ہری چند باہر چلا گیا۔

شانتی انگڑائی لیتی ہوئی باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر برابر والے کمرے کا دروازہ کھولا تو دیکھا۔ کارپٹ پر رمیش اوندھا پڑا سو رہا ہے وہ اس کو دیکھ کر مسکرائی اور سنگھار میز پر بیٹھ کر میک اپ کرنے لگی۔

رمیش نے کروٹ لی تو دیکھا شانتی پھولوں کی مالا بڑے انہماک سے درست کر رہی ہے گویا بھگوان کے چرنوں میں جانے کے لیے پھولوں کا ارپن کرنا ضروری ہو۔ وہ لیٹے لیٹے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک خیال سے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ تو کہتی ہے رمیش جب تم آجاتے ہو تو میں پھر کسی کو منہ نہیں لگاتی، کیا معاملہ ہے۔ کون ایسا ہے جس کے لیے سوتے سوتے اُٹھ کر تیاری ہو رہی ہے۔ مردانہ غیرت جوش میں آئی کہ ایک نظر اس بھاگوان کو دیکھنا تو چاہیے کہ یہ سورما کون ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر اس میں ہلکی سی درز کی اور اس میں آنکھ لگا کر دیکھا تو ایک آدمی بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ وہ آدمی ہری چند دلال سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ جوں ہی اس نے اپنا چہرہ دروازے کی جانب گھمایا ارے... رمیش کے دماغ میں کوندے لپکنے لگا۔

"روپ چند بابو... مالک، میرے پُرانے آقا، بڑے بابو"

روپ چند بابو کو دیکھ کر اُسے اپنا دیش کانپور یاد آگیا اور لڑکپن کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔

وہ بھی کیا دن تھے، کتنا سُکھ چین تھا۔ سب لوگ اُسے رمیش کے بجائے پیار سے رامو کہا کرتے تھے۔

وہ گاؤں سے آکر سیٹھ لال چند کے یہاں ملازم ہوا تھا۔ اُن کا بھرا پُرا پریوار تھا سیٹھ لال چند کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑے روپ چند بابو تھے، جنھیں سب بڑے بابو کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد ونود اور کشور تھے۔ ان سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ سب آپس میں مل کر کھیلا کرتے تھے۔

روپ چند یعنی بڑے بابو بہت کڑے مزاج کے تھے۔ کھیل میں اگر کچھ گڑ بڑ ہو جاتی تو سارا الزام اس کے سر دھر دیتے اور بات بات میں پٹائی کیا کرتے تھے۔ کملا اور بملا بہت سُندر تھیں۔ وہ ان کے اسکول کے کپڑے بڑے چاؤ سے دھویا کرتا، کیوں کہ ان کے میلے کپڑوں میں سے ایک خاص قسم کی باس آیا کرتی تھی جس کو اس کا من بہت پسند کرتا تھا۔ وہ ان کی قمیص شلواروں کو مسلتا ہی رہتا اور دیر تک رگڑتا رہتا اور خوب خوب صاف کرتا۔ باقی گھر بھر کے کپڑے ایسے ہی بے دلی سے دھو دیا کرتا۔

کشور اس کے برابر کا ہی تھا اس لیے اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی گھر سے حلوہ پوری چرا کر لاتا تو رامو کو ضرور کھلاتا۔ مالکن ماتا جی بہت نرم دل تھیں وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

حالاں کہ ان کے گھر میں بھور چھ بجے صبح سے رات گئے تک وہ لٹو بنا گھومتا رہتا ہر کوئی اپنے اپنے کام کے لیے اُسے ہی طلب کرتا اور وہ حکم کی بجا آوری میں ادھر سے اُدھر دوڑتا رہتا۔ مگر پھر بھی آج کل کی زندگی سے اُسے بیتے دن بہت اچھے لگے۔

آج کل وہ ایک دفتر میں چپراسی تھا۔ پانچ بجے دفتر بند ہو جاتا اور اس کی چھٹی ہو جاتی تھی مگر جو سُکھ اُسے کشور اور بملا کے ساتھ کھیل کر ملا تھا وہ اب کہاں؟

وہ دن خواب و خیال ہو گئے۔ کہاں گئے وہ دن؟ کیوں ایسا ہوا؟

اب لے دے کے ایک شانتی کا سہارا ہے لیکن بھلا رنڈی بھی کہیں سہارا بن سکتی ہے اس کے پہلو میں کچھ وقت تو کٹ جاتا ہے لیکن من کو سکون نہیں ملتا۔ رنڈی تو ہرجائی ہوتی ہے

ابھی میری ابھی تیری جس نے سکّہ پھینکا اُسی کی ہو گئی۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کیا کرتی تھی۔ ریش تم جو آجاتے ہو تو مجھے بڑا آنند ملتا ہے۔ جی میں آتا ہے تمھارے چوڑے سینے میں منہ چھُپائے پڑی رہوں۔ پر ابھی کیا ہوا کیا راتوں رات میرے باجو کم جور ہو گئے . . . ؟ یا سینہ دُبلا ہو گیا جو بڑے بابو کے لیے سنگھار کر رہی ہے۔ یہی بڑے بابو انھیں کے لیے اُسے بمبئی میں ٹھوکریں کھانا پڑ رہی تھیں۔

کانپور میں اُن کے گھر کا دستور تھا۔ رات کو سوتے سمے سب لڑکے لڑکیاں دودھ پیا کرتے تھے اور وہی سب کے کمروں میں دودھ کا گلاس پہنچایا کرتا تھا۔ دودھ پینے کو اس کا من بھی چاہتا تھا لیکن بھلا نوکر کے بھاگ میں دودھ کہاں؟ اپنے بھاگ میں دودھ کی گنجائش نکالنے کے لیے اس نے دوسروں کے بھاگ میں سے کٹوتی شروع کر دی تھی۔ وہ تھوڑا تھوڑا سب کے حصے میں سے دودھ بچا کر وہیں رسوئی میں چھپا دیتا اور سب سے آخر میں جب وہ خود سونے جاتا تو جمع شدہ دودھ پی لیا کرتا۔

ایک روز دودھ کم آیا تو وہ اس میں سے اپنا حصّہ نہیں نکال پایا۔ سب سے آخر میں بڑے بابو کے لیے دودھ لے کر جا رہا تھا۔ گلاس سے اُٹھتی ہوئی دودھ کی گرم بھاپ کی مہک اس کے حواس سے ٹکرائی تو وہ یوں رُک گیا جیسے چلتے چلتے کوئی ٹرین کے الارم کی چین کھینچ لے، اس نے اپنی ناک کے نتھنوں کو سکوڑ کر ایک گہری سانس بھری تو گرم گرم دودھ کی لذّت سے اس کے منہ میں پانی آگیا پھر جیسے کسی خودکار مشین کا لیور دب جائے اس نے غیر ارادی طور پر گلاس میں سے دودھ کے دو بڑے گھونٹ غٹ سے چڑھا لیے۔ دیکھا تو گلاس آدھا رہ گیا۔ اب بہت پشیمان ہوا اور گھبرایا بھی کہ کہیں چوری پکڑی گئی تو کیا ہو گا۔ پھر اس خیال سے اُس نے دل کو ڈھارس دے لی کہ اوّل تو بڑے بابو خیال ہی نہیں کریں گے اور اگر انھوں نے دودھ کے کم ہونے کی شکایت بھی کی تو کہہ دوں گا آج دودھ کم آیا ہے۔ اور پھر ماتا کو تو معلوم ہی ہے یہی سب سوچتا ہوا ریش آگے بڑھتا رہا پھر وہ بڑے بابو کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر گلاس رکھ کر لوٹ ہی رہا تھا کہ بابو کی نظر گلاس پر پڑ گئی۔

"ارے یہ آدھا کیوں ہے؟"

رمیش نے بڑی صفائی سے جواب دیا ’’آج دودھ کم آیا ہے‘‘۔ مگر اسے کیا معلوم تھا گھر کی دوسری ملازمہ دُلاری نے اسے گلاس سے گھونٹ بھرتے دیکھ لیا ہے۔

اتنے میں دُلاری کمرے میں آ پہنچی اور جھٹ سے بولی۔

’’صاحب یہ دودھ نہ پینا یہ جھوٹا ہے۔ اس حرام خور رامو نے اس میں سے پیا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ وہ اُدھر کمرے میں آتے آتے یہ گلاس منہ کو لگا کر دودھ چڑھا رہا تھا‘‘

جیسے کوئی جنگل میں بھالو کو چھیڑ دے۔ بڑے بابو نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے رمیش کو گھور کر دیکھا اور پھر ایک لمبی غرّاہٹ کے ساتھ ان کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ ان کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے وہ شوں شوں کرتے ہوئے کمرے میں اِدھر سے اُدھر قلابازیاں کھانے لگے تاکہ کوئی ڈنڈا تلاش کر سکیں۔ اسی تلاش میں ان کی نظر اپنے جوتے پر گئی اور وہ جوتا لے کر شروع ہو گئے۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی چلتی جا رہی تھی۔

’’حرام خور آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا، آج تو مجھے اپنا جھوٹا پلا دیتا‘‘

رمیش ہر چند معافی مانگتا رہا۔ ماتا جی اور کشور نے بھی بہت سمجھایا لیکن انھوں نے خوب خوب بھڑاس نکالی اور مار مار کر گھر سے نکال دیا۔

انھیں خیالوں میں گم رمیش کی نگاہ سامنے گئی تو شانتی سنگھار کر کے کب کی جا چکی تھی۔ اس نے جھانک کر دوسرے کمرے میں دیکھا تو روپ چند بابو شانتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اس سے چپکے ہوئے بیٹھے تھے۔ شانتی کے وجود سے اُٹھتی ہوئی کاسمیٹک اور پرفیوم کی ملی جلی خوشبو چھوٹے سے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ اور وہ اس خوشبو سے مسحور ہو کر بڑی مست نظروں سے شانتی کو دیکھ رہے تھے۔ ہری چند نہ جانے کب کا دفع ہو چکا تھا۔ سامنے ٹیبل پر وہسکی کی کھلی ہوئی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ گلاسوں میں الکوحل کے پیدا کردہ ننھے ننھے بلبلے تیر تیر کر باہم اتصال میں مصروف تھے اور وہ جب ایک دوسرے میں مدغم ہوتے تو ایک بڑا بلبلہ گلاس کے بالائی جانب اُٹھ کر جھاگوں کو کچھ اور بڑھا دیتا جہاں پہلے سے ہی بڑے بابو کے جذبات کی طرح جھاگ

اُچھن کر آ رہے تھے۔

اچانک ایک خیال سے رمیش کو جُھر جُھری سی آ گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور جھٹ سے کمرے کا دروازہ کھول کر اُن کے سامنے آ گیا۔

اُس کو وہاں دیکھ کر شانتی کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا۔ پر اب اُسے شانتی سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ مُسکراتا ہوا سیدھا روپ چند بابو کی جانب بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑتا ہوا بولا۔

"نمستے بڑے بابو۔۔۔! مجھے پہچانا میں ہوں رامو۔۔"

روپ چند نے گردن ٹیڑھی کر کے ترچھی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بولے۔

"رامو۔۔۔؟ کون رامو۔۔۔؟"

"نہیں پہچانا بڑے بابو! میں ہوں آپ کا پُرانا نوکر جو کانپور میں آپ کے گھر میں کام کیا کرتا تھا وہی رامو ہوں"۔

"او۔۔۔ ہو۔۔۔ اچھا اچھا تو تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"نہیں صاحب کام نہیں کرتا بس دل بہلانے چلا آتا ہوں۔ میں نے برسوں، آپ کا نمک کھایا ہے میری آپ سے بنتی ہے آپ یہاں سے چلے جائیے۔ یہاں آپ کو جھوٹن ملے گی میری جھوٹن۔۔۔"

رمیش یہ کہتے کہتے خاصہ جذباتی ہو گیا اور باہر کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

چھوٹا گھر

سوتے سوتے اچانک گڈو کی آنکھ کھل گئی۔ خوف سے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنے اردگرد دیکھا، اب نہ وہ کار ہی تھی اور نہ وہ سائیکل جس پر بیٹھ کر وہ جا رہا تھا۔ اُس کی سائیکل ایک کار سے ٹکرائی تھی اور وہ اُچھل کر سڑک پر جا گرا تھا اُس کی دونوں ٹانگوں میں سخت چوٹ آئی تھی۔ وہ زمین پر گرا ہوا رو رہا تھا کہ سامنے سے ایک پُرانا ٹرک کھڑ کھڑاتا ہوا آیا۔ گڈو نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے پاؤں بے کار ہو چکے تھے وہ ہل بھی نہ سکا اتنے میں وہ ٹرک سر پر آ گیا۔ گڈو کی چیخ نکلی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اُس کا اپنا ہی کمرہ تھا۔ اُس کی دونوں بہنیں کارپٹ بچھے فرش پر آڑی ترچھی لیٹی بے خبر سو رہی تھیں۔ چھت کا پُرانا پنکھا گھر گھراہٹ کے ساتھ چل رہا تھا اچانک اُسے کسی بیل گاڑی کے پہیوں کی چر چراہٹ سُنائی دی۔ اُس نے گھوم کر آواز کی جانب دیکھنا چاہا تو ایک کراہ اُس کے منہ سے نکل گئی۔ اُس کی دونوں ٹانگیں باجی کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ اُس نے لیٹے ہی لیٹے کسی نہ کسی طرح اپنی ٹانگوں کو باجی کے بوجھ سے آزاد کیا اور دوبارہ گھوم کر آواز کی جانب دیکھا۔

اُدھر اُس کے پاپا اور امّی کی مسہری تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ زیرو بلب بھی شاید خراب ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر ڈر کے مارے اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اب اُس کے پیروں میں جان آ گئی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بہنوں کو پھلانگتا ہوا امّی کے پاس جانے کے لیے اُن کی مسہری کی جانب لپکا۔

مسہری کے پاس پہنچتے ہی وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ملگجے اندھیرے میں اس نے دو تین بار اپنی پلکیں جھپکائیں۔ امّی کہاں ہیں...؟

اوہو شاید امی بھی بے چاری پاپا سے دب کر رہ گئی ہیں۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا امی ...!

مسہری کے پاس جیسے بم کا دھماکہ ہوا ہو۔ اُس کے پاپا اور امی دونوں ہی اُچھل پڑے۔ اُس کی امی نے ستر پر چادر ڈالتے ہوئے بوکھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے کیا ہوا بیٹے؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر ... کیوں تمھیں ڈر کیوں لگ رہا ہے کیا کوئی خواب واب دیکھا ہے؟"

"ہاں امی میں آپ کے پاس سوؤں گا۔"

"اچھا چلو اپنی جگہ پر چل کر لیٹو میں بھی تمھارے پاس آکر لیٹ جاؤں گی۔"

پھر کچھ دیر بعد جب اس کی امی نے اس کے پاس لیٹ کر اس کو تھپکنا شروع کیا تو اس کا ننھا سا ذہن ڈر خوف بھول کر نئی وادیوں میں بھٹکنے لگا یہ پاپا اور امی کیا کر رہے تھے ...؟

اُسے یاد آیا کچھ روز قبل ٹی وی پر سب انگلش فلم دیکھ رہے تھے اس میں ہیرو ہیروئن اپنے بیڈ روم میں باتیں کر رہے تھے کتنا اچھا تھا بیڈ روم اُن کا، نرم نرم بستر، نرم نرم کمبل پھر باتیں کرتے کرتے اُس آدمی نے اپنی شرٹ اُتاری تو اُس کی امی نے فوراً ہی چینل تبدیل کر دیا تھا اور غصہ ہو کر پاپا سے بولی تھیں "ذرا خیال تو کرو بچے بھی دیکھ رہے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ چینل چینج کر دوں۔"

وہ سوچنے لگا اس میں کوئی خاص بات ضرور ہے کہ بڑے لوگ بچوں کو دکھلانا نہیں چاہتے۔ ابھی بھی امی نے اس کو مسہری پر چڑھنے نہیں دیا اور پھر پاپا نے شرٹ بھی تو اُتار رکھی تھی بالکل فلم کے ہیرو کی طرح۔ اب امی سے پوچھوں گا تو وہ کبھی بھی نہیں بتلائیں گی۔ پھر کس سے پوچھوں ...؟

یہی سب سوچتے سوچتے اس کا ننھا سا ذہن نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسرے دن اُس نے امی سے پوچھا "امی کل آپ نے ٹی وی کا چینل بدل کیوں دیا تھا اُس میں کیا ہوتا؟"

"کچھ نہیں بیٹے بس یوں ہی۔"

"مگر آپ تو پاپا پر غصہ بھی ہوئی تھیں۔"

"نہیں میں کہاں غصہ ہوئی تھی۔"

"ہوئی تھیں! میں نے خود دیکھا تھا۔"

"اوہو تم بہت حجّت کرنے لگے ہو، بال کی کھال نکالتے ہو۔ اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔"

وقت کے ساتھ ساتھ گڈو اس واقعہ کو بھولتا چلا گیا لیکن ٹی وی کے اسکرین پر اس کی متجسس نگاہیں لاشعوری طور پر اب بھی کسی خاص سین کی متلاشی رہتیں۔

ایک دن باجی اس کا ہوم ورک کرا رہی تھیں۔ سامنے ٹیلی ویژن چل رہا تھا باجی ٹی وی بھی دیکھتی جا رہی تھیں اور اس کا ہوم ورک بھی بتلاتی جا رہی تھیں کہ گڈو نے باجی سے ایک ورڈ کی مینِنگ دریافت کی۔ جواب نہ ملنے پر اس نے باجی کی طرف دیکھا وہ تو ٹی وی میں کھوئی ہوئی تھیں۔ بے اختیار گڈو کی نگاہیں ٹیلی ویژن کی جانب چلی گئیں۔

وہاں کچھ ایسا ہی سین تھا جس کو اس کی نگاہیں عرصہ سے تلاش کر رہی تھیں۔ وہ غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ یہ عجیب سا تماشہ اُسے بہت اچھا لگا۔

کچھ دیر بعد سین بدلا تو اس کی باجی نے محسوس کیا کہ گڈو پڑھنے کے بجائے ٹی وی دیکھنے میں محو ہے۔

"گڈو یہ کیا کر رہے ہو پڑھتے کیوں نہیں؟" انھوں نے آنکھیں نکالیں۔

گڈو نے گھبرا کر پڑھنا شروع کر دیا مگر اس کے چھوٹے سے ذہن میں وہی سین چکراتا رہا۔ پڑھنے میں اس کا جی لگ ہی نہیں رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح ہوم ورک ختم ہو گیا مگر اس کے دماغ میں وہی سین کافی دن تک گھومتا رہا۔

دو سال اور گزرے اب وہ کچھ اور بڑا ہو گیا تھا۔ ایک رات سوتے سوتے اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو پیشاب آ رہا تھا۔ اس نے تکیے سے سر اوپر اُٹھایا، خلافِ

معمول زیرو بلب آج بھی خراب ہوگیا تھا۔ کمرے میں اچھی خاصی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ دور سڑک کے کھمبے کے فلوروسینٹ بلب کا مدھم سا عکس اوپر کے روشن دان سے اندر کمرے میں آرہا تھا۔ پیشاب کی حاجت سے بے قرار گڈو نے بستر سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اسے سامنے مسہری پر سائے سے حرکت کرتے نظر آئے۔ خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے مسہری کی جانب تکنے لگا۔ جب اُس کی نگاہیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں تو اُس کے سامنے بالکل ٹی وی والا سین تھا۔ اُس کا منہ حیرت سے کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

تو کیا...؟ تو کیا...؟ اس کے اسکول کے ساتھی جو کچھ کہتے ہیں وہ سب سچ ہے...؟ تو کیا اُس کے پاپا اور امّی بھی ...؟ اس سے زیادہ وہ نہیں سوچ سکا۔ فوراً ہی اس کو آنکھیں موند کر لیٹ جانا پڑا کیوں کہ اب اس کے پاپا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جا رہے تھے۔

وہ اپنی حاجت کو بھول گیا۔ اس کے ننھے سے ذہن میں پاپا امّی، ٹی وی گڈمڈ ہوتے رہے۔ پھر اس کا دوست ناصر اُس سے کہتا ہاں یہ سچ ہے میں نے خود اپنے پاپا امّی کو دیکھا ہے۔

"تمھارے پاپا ہوں گے گندے میرے پاپا ایسے نہیں ہیں"۔ گڈو جواب دیتا۔

"اچھا بتلاؤ تو پھر بچّے کہاں سے آتے ہیں؟"

"اللہ میاں کے گھر سے"۔

"نہیں، بھی تو تم نہیں جانتے! بچّے اپنی ممّی کے پیٹ میں سے آتے ہیں، خبر بھی ہے"۔ ناصر نے مربیانا انداز میں سمجھایا۔

گڈو کو یاد آیا جب اس کی امّی کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو وہ دو روز کے لیے اسپتال چلی گئی تھیں اور واپسی پر اُن کے پاس ایک ننھی مُنّی بے بی بھی تھی۔ سُرخ سُرخ، لال لال آنکھیں بند، ہاتھ پاؤں سکڑے ہوئے، وہ سب کی نظریں بچا کر اس کو بار بار اپنی انگلی سے ٹھوکا دیتا تو وہ کسی کوڑے کی طرح کلبلا کر ہاتھ پاؤں سکیڑتی اور بجائے

اپنی آنکھیں کھولنے کے اور زور سے بھینچ کر بند کرلیتی، اس نے باجی سے پوچھا یہ بےبی اتنی نرم اور لال کیوں ہے؟

"نیو بورن ہے اس لیے۔"

"تو کیا سب نیوبورن بے بی ایسی ہی ہوتی ہیں؟"

"ہاں!"

"اچھا باجی یہ نیوبورن بے بی آتی کہاں سے ہیں؟"

"ہمیں نہیں معلوم بال کی کھال مت نکالا کرو۔" باجی نے آنکھیں نکالیں

گڈو سوچتا رہا رات گزرتی رہی۔ کچھ جاگتے کچھ سوتے۔ کسی نہ کسی طرح صبح ہوئی تو وہ جلدی ہی اٹھ گیا۔ کیوں کہ اس کو آج اسکول جانے کی بہت جلدی تھی وہ اپنے دوست ناصر کو بتلا دینا چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہتا تھا وہ سچ ہے آج اُس نے بھی سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

دن اسی طرح آنکھ مچولی میں گزرتے رہے۔ اب گڈو کو اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا تھا جب بھی سوتے سوتے اس کی آنکھ کھلتی تو اس کی نظر تیر کی طرح زیرو بلب پر جاتی کہ بلب جل رہا ہے یا نہیں۔ وہ اکثر آنکھیں موندے سوتا بنا پڑا رہتا اس کی امی کی آواز آتی۔

"بچے اب بڑے ہو گئے ہیں کب سے کہہ رہی ہوں دو کمروں والا فلیٹ لے لو اب ایک کمرے میں گزر نہیں ہونے کی۔"

اس کے پاپا کہتے بھئی کیا کریں اس شہر میں دو کمروں کا فلیٹ لینا مذاق نہیں ہے۔ پھر آوازیں مدھم سے مدھم تر ہوتی جاتیں، سرگوشیاں سرسراہٹوں میں تبدیل ہو جاتیں اور گڈو کا ذہنی سفر اپنی راہ پر گامزن ہو جاتا۔

گڈو اور ناصر اپنے ذہن میں پرورش پاتے اس نئے جذبے کی لذت کے حصول کے لیے بک اسٹالوں کے چکر لگاتے۔ ان کی نگاہیں نیم عریاں پوز والے فوٹو تلاش کرتی رہتیں جو اکثر رسالوں کے فرنٹ یا بیک پیج پر چھپی ہوتیں۔ وہ فوٹو دیکھتے نگاہوں نگاہوں

میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے، مسکراتے اور کبھی کبھی کوئی میگزین زیادہ پسند آجاتا تو خرید بھی لیتے۔

یہ گڈو کی چودھویں سالگرہ تھی جب وہ اپنے چچا کے گھر سالگرہ میں شرکت کی دعوت دینے اُن کے گھر گیا۔ چچا کام پر گئے ہوئے تھے۔ چچی گھر پر تھیں۔

سالگرہ کی دعوت قبول کرنے کے بعد چچی نے گڈو سے کہا۔

"گڈو! تمھیں کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"کیوں! کیا بات ہے؟"

"میں کہہ رہی تھی تم ذرا دس منٹ کے لیے منّے کے پاس ٹھہر جاتے تو میں نہا لیتی۔"

گڈو کو کوئی کام نہیں تھا اس نے حامی بھر لی اور منّے سے کھیلنے لگا۔

جب چچی نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا تو ایک انجانے جذبے کے تحت گڈو کے احساس میں گدگدی سی ہونے لگی وہ سیدھا باتھ روم کی جانب آیا اور دروازے میں کوئی دراز تلاش کرنے لگا۔

ایک جگہ اس کو باریک سی جھری مل گئی۔ جیسے ٹی وی پر کسی صابن کا اشتہار ہو رہا ہو بالکل اسی طرح چچی کے جسم کے صابن کے جھاگ لگے حصّے اس کی نظر کے سامنے چکرا رہے تھے۔

اچانک مُنّے نے رونا شروع کر دیا مُنّے کے رونے کی آواز سن کر چچی آوازیں لگاتی رہیں۔

"گڈو! مُنّا۔۔ کیوں رہا ہے؟"

لیکن گڈو ان سب آوازوں سے بے خبر خورد بین پر جھکا ہوا اپنے ذہن میں سرایت کرنے والے جراثیم کی پیداوار کا مطالعہ کرتا رہا، چچی کا غسل ختم ہوتے ہوتے گڈو کی آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو چکے تھے۔ مُنّا روتے روتے سو چکا تھا جب تک چچی باتھ روم سے باہر نکلیں وہ مُنّے کے پاس جا کر لیٹ گیا۔

اُس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اچانک اُسے ایک خیال آیا وہ سیدھا باتھ روم میں گیا اب اس کی نگاہوں کا مرکز ہُک پر لٹکتی ہوئی چچی کی میلی بریسیر تھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ بریسیر کی جانب بڑھا۔ اسپنج لگے کپڑے کی نرمی سے اس کے جسم میں لہریں اٹھنے لگیں۔

پھر چچی نے ہی اسے پکارا "گڈو کہاں ہو؟"

چچی کی آواز سنتے ہی اس کے ہاتھ کا شکنجہ ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ پھر غڑاپ سے وہ بریسیر اس نے اپنی پتلون میں چھپا لی۔

اب گڈو کا معمول بن گیا تھا۔ وہ روز اپنی چچی کے گھر جاتا اور دیر تک منّے کو کھلاتا رہتا جس دن چچی نہانے نہیں جاتیں اسے بہت کوفت ہوتی۔

کہتے ہیں عورت میں ایک خاص حس ہوتی ہے اسے چاہے جتنا بھی چھپ کر دیکھو وہ حس اسے خبردار کر دیتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور شاید یہ اس کی چھٹی حس ہے جو اس کے شعور پر اخفا کے پڑے ہوئے پردے چاک کر دیتی ہے۔

بالکل یہی گڈو کی چچی کے ساتھ بھی ہوا پہلے وہ غسل کرتے کرتے چونک جاتیں اور ان کی متوحش نظریں غسل خانے میں گردش کرنے لگتیں پھر جب یہ واردات کئی بار ہوئی تو ان کی نظر اپنی حس کی پیش بینی پر باتھ روم کے دروازے کی مہین سی دراز کی جانب چلی گئی۔ انھوں نے اثبات میں اپنی گردن کو دو تین بار جنبش دی جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا ہو۔

دوسرے دن انھوں نے باتھ روم میں جاکر قمیص اُتاری پھر دراز سے ہٹ کر دوبارہ پہن لی اور آہستہ سے کواڑ کھولا تو گڈو باتھ روم کے دروازے کے پاس اکڑوں بیٹھا متجسس نظروں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ بات گڈو کے پاپا اور امی تک پہنچی۔

لیکن گڈو نے تسلیم نہیں کیا وہ یہی کہتا رہا کہ وہ فرش پر بیٹھا ہوا چیونٹیوں کی قطار دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد چچی کے گھر گڈو کی آمد و رفت بند ہو گئی۔

وہ جو کہتے ہیں ایک در بند تو ستّر کھلے بالکل اسی طرح گڈو کی آمد و رفت اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے گھروں پر بھی تھی۔ ایک روز وہ اپنے دوست جمال کے گھر پر پڑھائی میں مصروف تھا کہ اُسے باتھ روم کی ضرورت پیش آئی۔ وہ گنگناتا ہوا باتھ روم کی جانب بڑھا۔ پھر ایکدم اس کی گنگناہٹ کو پورا بریک لگ گیا۔ جیسے کوئی ٹیپ ریکارڈ چلتے چلتے اچانک خراب ہو جائے۔ اس

ں نظر سامنے کھونٹی پر لٹکی ہوئی ایک براسیر پر جم کر رہ گئی تھی۔ جیسے کسی چھوٹے بچے کو اپنی پسند کا کھلونا نظر آ جائے۔ اسی طرح گڈو کے چہرے پہ بھی تبسّم کا نور پھیلتا چلا گیا۔ خود کارانہ طور پر اس کا ہاتھ براسیر کی جانب بڑھا۔ ایک عجیب قسم کی مہک اس کے حواس نے محسوس کی۔ کچھ دیر وہ اس کو ہاتھ میں لیے یوں اُلٹتا پلٹتا رہا جیسے کسی شرابی کو غیر متوقع طور پر بوتل مل جائے۔ پھر پٹھوں کی اکڑن کے ساتھ ساتھ وہ اس کی مٹھی میں چرمرانے لگی۔

اچانک جمال کی آواز آئی "گڈو....! چائے آگئی"۔

یہ آواز سمندر میں اُٹھتی موجوں کے تھپیڑوں سے ٹکرائی تو سارا ہیجان پاش پاش ہو کر جھاگوں کی طرح حواس کی ریت میں جذب ہوتا چلا گیا۔

گڈو کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے دو تین بار اپنی پلکیں جھپکائیں اور پھرتی سے وہ براسیر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لی۔

پھر تو گڈو کا معمول بن گیا۔ وہ جس کسی کے بھی گھر جاتا اس کو باتھ روم کی حاجت ضرور پیش آتی۔

آج اتوار تھا۔ گڈو کے گھر سب رشتے دار جمع تھے۔ مل کر پکنک پر جانے کا پروگرام بنا تھا۔ روانگی میں ابھی دیر تھی۔ سب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ رضیہ مامی جو کئی روز سے گڈو کے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ درمیان میں گڈو کی امّی کو مخاطب کر کے بولیں۔

"آپا! آپ کے گھر میں کیا جن بھوت رہتے ہیں؟"

"کیوں! کیا ہوا؟" گڈو کی امّی نے مستفسرانہ نگاہیں اُٹھا کر پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہی تھی پرسوں میں اپنی محرم باتھ روم میں بھول گئی تھی۔ شام کو یاد آیا جا کر دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھی اور آج ایک گھنٹے قبل میں نے اپنی محرم وہاں چھوڑی ہے سوچا تھا کپڑوں کے ساتھ اس کو بھی دھو ڈالوں گی لیکن وہ وہاں سے غائب ہے"۔

"دلہن ٹھیک سے دیکھو ان کپڑوں میں ہی ہوگی بھلا تمھاری محرم کون لے گا" گڈو کی امّی مسکرا کر بولیں۔

"میں نے اچھی طرح کپڑوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا وہاں اُس کا پتہ بھی نہیں ہے"

"گڈو سے پوچھو" چچی نے کراری سی مداخلت کی۔

"کیوں ...؟ گڈو سے کیوں پوچھیں۔ گڈو اس کا کیا کرے گا؟" گڈو کی امی نے تیوریاں چڑھائیں۔

"ہمیں کیا معلوم؟ وہ اُس کا کیا کرتا ہے یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں آپ کو سب معلوم ہے۔ پہلے بھی یہ واقعہ میرے گھر پر ہو چکا ہے۔"

گڈو کی امی کے تلوے میں لگی اور سر پر بجھی وہ بپھر کر بولیں۔ خواہ مخواہ بے کار کا الزام نہ رکھو۔ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

"میں الزام نہیں رکھتی دیکھ لینا وہ گڈو نے ہی لی ہوگی۔"

دونوں عورتوں میں تکرار ہونے لگی تو تائی اماں کو مداخلت کرنا پڑی۔

"دلہن کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بھلا گڈو اس موئی کا کیا کرے گا؟"

"یہ تو گڈو ہی جانے، آپ اس کے سامان میں کیوں نہیں تلاش کرتیں؟

گڈو کی امی غصّے سے سُرخ ہو گئیں۔ وہ تڑپ کر اُٹھیں اور لمبے لمبے قدموں سے جا کر گڈو کی الماری کھولی اور تمام چیزیں نکال کر باہر بکھیر دیں "لیجیے! خود ہی دیکھ لیجیے۔" پھر ہاتھ بڑھا کر چھوٹا سا اٹیچی کیس الماری کے اوپر سے اُٹھایا "لیجیے یہ بھی دیکھ لیجیے۔ اس میں اس کی پُرانی کتابیں رہتی ہیں۔" انھوں نے غصّے میں ایک جھٹکے سے اٹیچی کھولا تو سب کی نگاہیں فرطِ حیرت سے اُبل پڑیں گویا ان کے سامنے سانپوں بھرا پٹارہ کھول دیا گیا ہو۔

گلچیں کا خمار

عادل منزل کے حویلی نما مکان کے بڑے آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے اینٹوں سے بنا چولہا جل رہا تھا جس کے اوپر ایک بڑے پتیلے میں میت کے غسل کے لیے پانی گرم ہو رہا تھا۔ پاس ہی بچھے تخت پر بیٹھی دو بزرگ عورتیں کورے لٹھے کی پیمائش میں مصروف تھیں۔ سامنے ہی کھجور کی چٹائی پر مٹی کا لوٹا، بیری کی شاخیں، خوشبویات اور ایک پلیٹ میں کافور رکھا تھا جس کی تیز بو چولہے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ مل کر حواس کو نڈھال کیے دے رہی تھی۔ میت کے آخری دیدار کے لیے آنے والی عورتوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تو وہاں کھڑی ہو کر خاموشی سے ماحول کا جائزہ لیتیں پھر کافور آلود دھوئیں کے کچوکوں سے گھبرا کر سیدھا دالان کا رُخ کرتیں۔

اب دالان کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ محلّے سے لے کر دور دراز تک کی عورتیں اُمڈ آئی تھیں سانحہ ہی ایسا تھا۔ گذشتہ رات اچانک عادل حسین صاحب کی بیگم کا انتقال ہو گیا تھا تعزیت کے لیے آئی عورتیں مختلف قسم کی باتوں میں مشغول تھیں جس سے پورے گھر میں دبا دبا سا شور ہو رہا تھا۔ باتوں کا موضوع مرحومہ کی اچانک موت ہی تھا۔ زیادہ تر کو یہ فکر لاحق تھی انتقال اچانک کیسے ہو گیا؟ اور یہ فکر کی بات بھی تھی کیوں کہ معاملہ کسی غریب کا تو تھا نہیں غریب کا معاملہ ہوتا تو فکر کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ غریبی اور غربت تو خود ایک موذی بیماری ہے اور کسی بھی موذی بیماری سے نجات وہ اچانک ملے یا طے شدہ پروگرام کے تحت کبھی بھی تردد کا باعث نہیں بنتی مگر یہاں تو معاملہ بڑے آدمی کا تھا۔ شہر کے سب سے زیادہ رئیس آدمی کی بیگم اپنے ہنستے کھیلتے گلزار جیسے گھر بار کو اچانک خیر باد کہہ کر تاریک وادیوں میں بسنے

چلی گئی تھیں۔

طرح طرح کی آوازیں قسم قسم کے سوالات تھے "اے بہن یہ بیمار تو تھی نہیں پھر یہ اچانک کیا ہو گیا؟"

" بیمار کیوں نہیں تھیں عرصے سے ذیابیطس کی مریضہ تھیں۔ قلب کا عارضہ بھی ہوا تھا۔ بہت دنوں سے بڑے حکیم صاحب کا علاج چل رہا تھا" جواب میں ایک صاحبہ نے اپنی معلومات کا سکہ جمایا۔

" ہاں بہن موت کو تو ایک بہانہ چاہیے" ایک اور خاتون لمبی سانس کھینچتے ہوئے بولیں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے " حیلہ رزق بہانہ موت" بس جب جس کا وقت آجائے" جواب میں سب نے سرد آہیں بھرتے ہوئے اپنی اپنی گردنوں کو اثبات میں جنبش دی۔

کچھ عورتیں حالیہ رونما ہونے والے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں " اے بہن سنا ہے شکیلہ کے میاں نے اسے مار کر نکال دیا"

دوسری عورت نے اثبات میں پٹ سے اپنی آنکھیں جھپکا کر گردن ہلائی " ہاں بہن ہے ہی وہ ایسی لڑاکا اور بدزبان میں نے پہلے ہی کہا تھا دیکھنا اس کا نباہ زیادہ دن نہیں ہو سکے گا وہ تو اس کا میاں شریف ہے جو اتنے دن تک برداشت کرتا رہا"

"کیسی باتیں کرتی ہو آپا اس کا میاں بھی کم نہیں ہے"

پھر ایک تیسری آواز ابھری" وہ جو مثل مشہور ہے بدزبان عورت اور بے لگام گھوڑی پر قابو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں" اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ پڑا۔ قہقہے کی آواز پر دوسری عورتوں نے گھور کر انھیں دیکھا تو وہ ٹولی منتشر ہو گئی۔

پھر ایک جگہ سے آواز ابھری" سنا ہے جلال بھائی کے بیٹے نے نکاح کر لیا"

"آپا غنیمت جانیے نکاح ہی کیا ہے لے کر نہیں بھاگا کالج میں پڑھتا ہے نا"

"لیکن معلوم ہوا ہے لڑکی غیر مذہب کی ہے"

" پتہ نہیں! مجھے تو بس اتنی خبر ہے غیر ذات کی لڑکی ہے۔ اب وہ ہندو ہے یا مسلمان اس کا پتہ نہیں۔ ویسے جلالی صاحب سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ بیٹا طلاق

دے دے لیکن وہ اڑا ہوا ہے۔"

مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی عورتیں اسی قسم کی باتوں کے ساتھ کچھ اپنے بچّوں کی دُکھ بیماری کا رونا بھی رو رہی تھیں یا پھر ایک دوسرے کے کپڑوں یا زیورات کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان سب سے بے نیاز دالان کا کھمبا پکڑے نفیسہ بانو گہری سوچوں میں غرق کھڑی تھیں۔ کبھی کبھی ان عورتوں کی باتوں سے ان کی ذہنی رو ماضی کے خیالات کے تسلسل سے ہٹ جاتی اور وہ چونک کر ان عورتوں کی باتیں سُننے لگتیں۔ لیکن پھر کچھ ہی لمحوں میں پُرانی یادوں کے سمندر میں طغیانی آجاتی اور وہ پھر اس میں ڈوب جاتیں۔ آج سے بائیس تیئیس سال قبل وہ بیحد حسین ہوا کرتی تھیں اور ان کے چچازاد یہ عادل بھائی جن کی بیگم کا انتقال ہوا ہے اپنے لڑکپن میں چھپ چھپ کر انھیں دیکھا کرتے تھے۔

ایک لڑکا جب کسی لڑکی کو بار بار دیکھے یا اپنی پسند کا اظہار کرے تو فطری طور پر اس لڑکی کے دل کو نرم نرم پُروائی کے جھونکے گُدگُدانے لگتے ہیں۔ ایک انوکھی لذت کے احساس سے اس کے معصوم ہونٹوں کی کلیاں کھل جایا کرتی ہیں جیسے مُسکراتے چاند سے سمندروں میں طغیانی آجاتی ہے۔ ایسے ہی یہ تبسم بلاخیز بن کر جوان دلوں کی دنیا اُتھل پتھل کر دیتا ہے۔ اور جوان خون کی گردش ننھی ننھی چنگاریوں کو جنم دینے لگتی ہے جو قلب کے کسی گوشے میں پوشیدہ شعلہ بننے پر آمادہ سازگار ہواؤں کا انتظار کیا کرتی ہیں اور اگر ان کو سازگار ماحول میسر نہ آسکے تو حالات کے دھارے میں بہہ کر یہ چنگاریاں اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔

یہی کچھ نفیسہ کے ساتھ بھی ہوا۔ سوائے ایک واقعے کے جب کہ اپنی سہیلی کے گھر سے واپسی پر اپنے مکان میں داخل ہوئیں تو اتفاق سے عادل بھی ان کے گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ ڈیوڑھی میں ان کا آمنا سامنا ہوگیا۔ دونوں نے اس اچانک ملاقات پر ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ بات نہ چیت عادل نے اچانک نفیسہ کا ہاتھ تھام لیا۔ شرم سے نفیسہ کے کان کی لویں تک سُرخ ہوگئیں اور دل اتنے زور سے دھڑکا جس کی دھمک پاس کھڑے عادل نے بھی سُن لی۔ پھر حیا کے احساس سے نفیسہ کی نظریں جھکتی چلی گئیں۔ ہائے اللہ کہہ کر ہاتھ چھڑا لیا اور پلٹ کر بھاگی۔ عادل نے سرشاری میں روکنا چاہا تو دوپٹہ ہاتھ میں آگیا۔ نفیسہ دوپٹہ

چھوڑ ہرنی کی مانند زقند بھرتی یہ جا وہ جا۔

اس واقعہ کے بعد عادل کاروبار کی غرض سے کلکتہ چلے گئے۔ ہندوستان پر انگریزوں کی عملداری تھی۔ کلکتے کا کاروبار چمکا ہوا تھا۔ ہر کوئی روزی روزگار کے لیے کلکتہ ہی جا رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں جنگ چھڑ گئی۔ جاپان نے کلکتے کے قریب ڈائمنڈ ہاربر پر بمباری کی تو کلکتے میں بھگدڑ مچ گئی لیکن عادل ڈٹے رہے کیوں کہ وہ جانتے تھے ایسے ہی موقعوں پر ایک کے دو اور دو کے چار بنتے ہیں۔ کلکتہ شہر جو ہندوستان بھر کو فارن گڈس سپلائی کرتا تھا اس کی گودیاں مال سے بھری پڑی تھیں۔ بڑے بڑے تاجر بمباری کے خوف سے اپنے مال کو سستے داموں فروخت کر رہے تھے۔ عادل اونے پونے مال کی خریداری کرتے اور ریلوے بکنگ کرا کے دہلی، ممبئی، کانپور اور پٹنہ جیسے شہروں میں جا کر مال فروخت کر آتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لکھ پتی بن گئے۔ پیسے کا یہ سیلاب ان کے دل سے پیار کی اس ننھی سی کونپل کو بھی بہا کر لے گیا جو لڑکپن کے انجانے کھیل میں خود رو پودے کی طرح اُگ آئی تھی۔ اب انھیں کچھ یاد بھی نہیں تھا۔ انھیں تو صرف پیسہ کمانے کی دُھن تھی۔

ادھر نفیسہ کے چہرے پر کھلتے ہوئے گلابوں کی مہک خاندان کے کئی لڑکوں کو مست کیے ہوئے تھی۔ اس حور شمائل کے کئی طلب گار پیدا ہو گئے تھے جو یوسف کی خریداری پر آمادہ تھے اور درونِ پردہ اپنے اپنے پیغامات نفیسہ کے ابا کے پاس پہنچا رہے تھے۔ نفیسہ بیچاری کسی معصوم گائے کی طرح مویشیوں کے میلے میں کھڑی کن انکھیوں سے اپنے خریداروں کو دیکھ رہی تھی جو اس کی سفید بے داغ چمڑی اور مضبوط کاٹھی کا سودا کرنے کے لیے اس کے گرد چکر لگا رہے تھے لیکن ان میں وہ نہیں تھا جس کی اس کے دل کو تلاش تھی۔ آخر نیلامی کی یہ بولی ایک ادنیٰ درجے کے خوبصورت نوجوان کے نام پر چھوٹ گئی۔

جمال معمولی گھرانے کا لڑکا تھا لیکن تھا برسرِ روزگار اور نیک۔ بس شادی ہو گئی۔ نفیسہ جمال کے سجیلے بدن اور خوبصورتی سے متاثر ہوئی۔ پھر جمال کی محبت نے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا اور وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس غنچے نے مسکرانا پہلے پہل کسی اور ہی بھنورے کی وارفتگی سے سیکھا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ کوئی لڑکا بھی ہوتا اسی تمنا میں جیتے جیتے ایک دن جمال کا انتقال ہوگیا۔ تقریباً اٹھارہ برس نفیسہ کا سہاگ قائم رہا۔ جمال کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے جو کچھ پاس پلے تھا وہ ان کی دُکھ بیماری میں کام آچکا تھا اپنے پرایوں میں اگر کوئی تھا تو وہ نفیسہ کے بڑے بھائی تھے سو وہ بیچارے بھی غریب تنگدست تھے۔ شوہر کے انتقال کے بعد نفیسہ کو تنگ دستی نے اپنے جال میں لپیٹ لیا۔

اِدھر عادل بھی اب کلکتہ چھوڑ اسی قصبے میں رہنے لگے تھے۔ وہ برادری کے سب سے بڑے آدمی مانے جاتے تھے۔ قدرت نے ان کے ساتھ ہر جگہ فیاضی دکھلائی تھی۔ حُسن کی دولت کے ساتھ مال و زر سے جہاں ان کی تجوریاں پُر کی تھیں وہیں اولادوں سے بھی ان کا گھر بھر دیا تھا۔ ان کو آٹھ لڑکے اور دو لڑکیاں دی تھیں۔ برادری میں جس کے یہاں جتنے زیادہ بیٹے ہوتے وہ اتنا ہی خوش نصیب سمجھا جاتا تھا۔ اس حساب سے عادل برادری کے خوش نصیب ترین آدمی کہلاتے تھے۔ ابھی وہ چار بچوں کی ہی شادیاں کر پائے تھے کہ بیوی اچانک فوت ہوگئیں۔

نفیسہ بانو کے دماغ میں یہ سب فلم چل رہی تھی کہ صحن سے آواز آئی ”میت کا آخری دیدار کر لیجیے۔ جنازہ اُٹھانے کے لیے مرد آنے ہی والے ہیں۔“ نفیسہ بانو نے چونک کر صحن کی جانب دیکھا۔ اپنی ہتھیلیوں سے دونوں آنکھوں کو ملا۔ پھر سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی وہ چھوٹے دالان کی جانب بڑھ گئیں جہاں گہوارہ رکھا ہوا تھا۔

عادل صاحب کی بیگم کو گزرے ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں ”عادل صاحب نکاح ثانی کرنا چاہ رہے ہیں۔“ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا دس دس بچوں کے باپ ہیں، بھلا اس عمر میں اب انھیں نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو کوئی ان سے ہمدردی جتاتے ہوئے کہتا ”بھئی زندگی کا سہارا تو چاہیے۔ پتہ نہیں زندگی کتنی لمبی ہے، اور پھر اولادوں کا بھی ایک مقام ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت تو ساتھ نہیں دے سکتیں۔“ عورتوں میں بھی گھر گھر قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ کوئی خیال ظاہر کرتی ”اے میں کہوں کسی بیوہ سے نکاح مناسب رہے گا۔ ویسے بھی کنواری بالی تو ملنے سے رہی۔“

تو دوسری منہ دبا کر کہتی ''اے ہے دس دس بچوں کے باپ ہیں۔ اگر کوئی بیوہ دو چار بچوں والی مل گئی تو کیا ہوگا۔ جواب استہزائیہ انداز میں ملتا ہوگا کیا پوری فوج بن جائے گی ''۔ سب منہ دبا کر ہنسنے لگتیں۔

یہ بات کنبے سے نکل کر پوری برادری میں گشت کرنے لگی جس کے نتیجے میں جوان سے لے کر ادھیڑ عمر تک کی بیوائیں خود کو نک ٹک سے درست رکھنے لگیں کہ شاید ہماری قسمت کا ستارہ چمک جائے۔

ان ہی دنوں نفیسہ بانو کی چھوٹی بیٹی جہاں آرا جب باہر سے کھیل کر واپس آئی تو ماں کو مخاطب کر کے بولی'' اماں! ججن بُوا نے کہا ہے کہ آج آپ گھر پر رہیں۔ وہ عصر کے بعد ہمارے گھر آئیں گی۔ انھیں آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' نفیسہ بانو نے سُنا تو ان کے لبوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا جیسے یہ بات غیر متوقع نہ ہو۔ دراصل ججن بُوا اس کنبے کی سب سے معمّر اور تجربے کار خاتون تھیں۔ اپنا کنبہ ہی کیا پوری برادری کے شادی بیاہ کے رشتے ججن بُوا کے توسط سے ہی انجام پذیر ہوا کرتے تھے۔ دن کے گیارہ بجے تھے، گرمی اپنے شباب پر تھی پھر بھی نفیسہ بانو کو ٹھنڈی ٹھنڈی پُروائی کا احساس ہوا۔ جیسے گھٹا جھوم کر آ گئی ہو اور ان کا تن من سب کچھ سرشار ہوا جا رہا ہو۔ جیسے گلی کے چوک میں کھڑے نیم کے درخت کی اوٹ سے چاند نے اپنا سر ابھار کر ان کے گھر میں جھانکا ہو اور وہ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم نرم چاندنی میں نہا گئی ہوں۔ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی عصر میں تقریباً چھ گھنٹے باقی تھے۔ عصر ہوتے ہوتے انھوں نے سنلائٹ صابن کی ٹکیہ سے کئی بار اپنے چہرے کو رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ آنکھوں میں دو دو سلائیاں سُرمے کی پھیریں۔ سر میں تیل ڈال کر چوٹی کی پھر طاق میں رکھے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگیں جہاں ان کے سر میں جگہ جگہ چاندی کے تار چمکتے ہوئے ان کی ڈھلتی جوانی کی چغلی کھا رہے تھے۔ انھوں نے کالی گھٹاؤں میں چمکتی ان روشن لکیروں کو دیکھا۔ اپنی کمر سے نیچے لٹکتی چوٹی پر نظر ڈالی اور ایک اونہہ کے ساتھ دوپٹے کے آنچل کو اپنے سر پر پھیلا دیا۔'' اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے دیکھتے کہیں اور پہنچ گئیں۔

وہ اپنے آنگن میں کھڑی ہیں کہ ایک کنکری ان کی پشت پر آکر لگی۔ انھوں نے گھوم کر دیکھا تو پڑوس کی چھت کی منڈیر سے عادل بھائی جھانکتے ہوئے شرارت سے مسکرا رہے تھے۔ نفیسہ بانو نے بڑی بے اعتنائی سے اپنا رُخ ان کی جانب سے پھیر لیا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ایک کنکری اور آکر لگی انھوں نے دوبارہ دیکھا اور پھر بے اعتنائی سے جلوہ گری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا رُخ پھیر لیا اب کہ کنکری بڑی تھی۔ انھیں چوٹ کا احساس تو ہوا لیکن وہ جمی کھڑی رہیں کیوں کہ یہ ہلکی پھلکی چوٹیں اس لذت کے احساس سے کئی گُنا کم تھیں جو خون کی گردش کے ساتھ اچانک سرور بن کر اُن کی رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ وہ عمر بھر اسی طرح بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتی رہتیں اور عادل بھائی چھت پر کھڑے ششش... ششش کرتے ہوئے انھیں اپنی جانب مخاطب کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ لیکن وہ تو کہیے اچانک ابا جان دالان سے نکل آئے۔ انھیں دیکھتے ہی عادل بھائی رفو چکر ہو گئے۔ اور پھر جب کبھی بھی وہ برآمدے کی کھڑکی کے قریب سے گزرتیں تو عادل بھائی ہلکے سُروں میں سیٹی بجاتے اور وہ اپنا آپا دکھلانے کی خاطر بار بار کھڑکی سے جھانکا کرتیں۔

وہ بار بار آئینے کے سامنے جاکر اپنے سراپے کا جائزہ لیتی رہیں۔ وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وقت تھم گیا ہے۔ یہ مارا گیا سورج آج کسی بیل گاڑی پر سوار ہو کر جا رہا ہے۔ وہ بڑبڑائیں ”ابھی دو ہی بجے ہیں اللہ جانے عصر کب ہوگی۔“

بہرحال کسی نہ کسی طرح دن ڈھلا اور رجّن بُوا ٹوپی والا سفید لٹھے کا بُرقع اوڑھے اُن کے گھر میں داخل ہوئیں۔ خیر سلا کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر رجّن بُوا مطلب پر آتے ہوئے بولیں ”اے نفیسہ! اپنا عادل نکاح ثانی کا خواہش مند ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئیں۔ جیسے مزید بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہوں۔

نفیسہ بانو نے انھیں پُرشوق نظروں سے دیکھا۔ ان کا وجود خوشبودار صابن کے نرم نرم جھاگوں میں نہا گیا۔ جھاگوں میں بلبلے بنتے اور پھٹتے رہے اور ہر بلبلے میں انھیں عادل بھائی کا چہرہ نظر آتا رہا۔

چھجن بُوا جو کہنا چاہ رہی تھیں وہ آسانی سے کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر اپنی گُدّی کو کھجلانے لگیں۔

نفیسہ بانو کا رواں رواں خوشی سے جھوم رہا تھا۔ کان ترانہ سننے کے لیے بیقرار تھے جس کو ان کا دل صبح سے اب تک نہ جانے کتنی بار گنگنا چکا تھا۔ ان کا جی چاہا کہ وہ برملا کہہ دیں چھجن بُوا جو کہنا ہے کہہ دیجیے اس میں حجاب کی کیا بات ہے لیکن وہ صرف اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئیں۔

چھجن بُوا نے اپنی نظریں اُٹھائیں اور مخاطب ہوئیں "بیٹی! میں تمھاری جانب جب بھی غور کرتی ہوں تو میرا کلیجہ کٹ جاتا ہے۔ اس کم عمری میں بیوہ ہو گئیں اور تین تین لڑکیوں کا بوجھ جس میں دو تو ماشاءاللہ سیانی ہو چکی ہیں۔"

"لیکن بُوا مہ پارہ جو بڑی ہے اس کی تو بات چیت طے پا چکی ہے۔" نفیسہ بانو نے جلدی سے وضاحت کی۔

"ہاں! ہاں! مجھے معلوم ہے" چھجن بُوا نے اثبات میں اپنا سر ہلایا "پر بیٹی قمر آرا بھی تو سیانی ہو چکی ہے، اور پھر تمھارے پاس پلّے بھی تو کچھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں یہ زندگی کتنی لمبی ہے۔ غربت میں بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنا آج کے زمانے میں کوئی کھیل تو ہے نہیں۔"

نفیسہ بانو کو اتنی لمبی چوڑی تمہید سے اُلجھن ہونے لگی۔ ان کے کان صبح سے کیف بھرے جن نغموں کو سُننے کے لیے بیتاب تھے وہ نغمے چھجن بُوا کی زبان پر آ ہی نہیں رہے تھے۔ وہ ابھی تک سُر تال ہی درست کر رہی تھیں۔ چھجن بُوا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی "میں یہ کہہ رہی تھی عادل کا خیال تمھاری قمر آرا کے ساتھ ہے۔"

اس خشک موسم میں جو گھنگھور گھٹائیں اُمنڈ کر آئی تھیں وہ طوفان بن گئیں۔ رعد کا خوفناک دھماکہ ہوا۔ بجلی تڑپ کر چمکی اور سیدھی نفیسہ بانو پر آن گری — ان کا وجود دھڑا دھڑ جلتے شعلوں کی زد میں آ گیا۔ کیا... ان کے منہ سے ایک چیخ نما آواز نکلی اور ان کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔

"بیٹی! اپنے حواسوں میں رہو۔" چھجن بُوا نے پکارا "یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ کما

کیا جائے۔ زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ آج کل مُٹھیا مزدور بھی کنواری دوشیزہ تلاش کرتا ہے اور پھر یہ تو ٹھہرے رئیس آدمی ان کو کیا کمی ہے۔ اللہ کے فضل سے ان کو ایک سے ایک مل جائے گی۔ ماشاءاللہ قمر آراسیانی ہے۔ شادی کے لائق ہو چکی ہے۔ گو کہ ابھی کم سن ہے لیکن یہ بھی تو سوچو تمہاری پوزیشن ہی کیا ہے۔ کس طرح اسے کہیں اور لگاؤ گی۔ پھر عادل نے وعدہ بھی کیا ہے وہ تم سب کو اپنی سرپرستی میں لیتے ہوئے تمہارے خرچ کے لیے مشاہرہ بھی مقرر کر دیں گے۔ اللہ کی رحمت سے تم بھی سُکھ سے رہو گی اور بچی بھی راج کرے گی۔ ایسے موقعے تو نصیبے والوں کو ہی ملا کرتے ہیں۔"

ججّن بُوا نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں لیکن یہ سب الفاظ نفیسہ بانو کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہے تھے۔ وہ تو ایک دشتِ بیابان میں کھڑی تھیں جہاں تیز تُند ہوائیں کمزور ریت کو بگولوں کی شکل میں اُڑاتی ہوئی چیخ چنگھاڑ رہی تھیں۔ آندھیوں کا شور تھا اور وہ تھیں بےبسی اور بےچارگی کے احساس سے دل بھر آیا تو ان کی آنکھوں سے دو موتی ٹپکے اور پھر تو جھڑی لگ گئی۔ بالکل بیساکھ کے خشک موسم کی طرح جہاں چاروں طرف پھیلی ہوئی دھوپ میں بھی کبھی کبھی بارش کی بوندوں کا تسلسل دیکھنے میں آجاتا ہے۔ یہ خشک موسم کی برسات جب ساون بھادوں میں تبدیل ہو گئی تو ججّن بُوا بھی خفیف ہو گئیں۔ کچھ دیر تک تو وہ گومگو کے عالم میں بیٹھی نفیسہ بانو کی صورت تکتی رہیں پھر ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے سر پر ہاتھ پھیرا اور "رومت! میری بچّی رومت!" کہتے ہوئے انھوں نے اپنے کلیجے سے لگالیا۔

شفقت اور پیار کی یہ گرمی بجائے اس کے کہ زخم پر ٹکور کا کام کرتی کسی بھالے کی اَنی کی طرح نفیسہ بانو کے جگر کو چھید گئی۔ ان کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور پھر متواتر چیخوں سے ججّن بُوا بھی پریشان ہو گئیں۔ تو انھوں نے گھبرا کر مہ پارہ کو پکارا "بیٹی ذرا کٹورے میں پانی تو لانا۔" پھر جیسے تیسے کر کے وہ نفیسہ بانو کو گھونٹ گھونٹ پانی پلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ دلاسہ بھی دیتی رہیں "بیٹی کوئی زبردستی تھوڑی ہی ہے۔ اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو نہ سہی یہ اپنے کو ہلکان کیوں کیے دے رہی ہو۔"

اللہ اللہ کر کے نفیسہ بانو کے اوسان بحال ہوئے اور وہ چپ چاپ وہیں چارپائی پر گم صُم لیٹ گئیں۔ چھجن بُوا اپنے ژولیدہ خیالات میں مبتلا کچھ دیر تک بیٹھی ہوئی نفیسہ بانو کو تکتی رہیں۔ پھر ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے بولیں "اچھا بیٹی میں چلتی ہوں ۔ میں سوچ رہی ہوں تمھارے بھائی سے بات کروں کیوں کہ تمھاری طبیعت تو خراب لگ رہی ہے۔ ویسے تم ذرا بھی رنج مت کرو جو تم چاہوگی وہی ہوگا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے ہوسکتا ہے اس نے تمھارے دکھوں اور پریشانیوں کا یہی مداوا نکالا ہو۔ بیٹی ذرا غور کرنا ایک ذراسی ہمت سے تمھیں بے بسی اور مفلسی کے عذاب سے نجات مل سکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے بُرقع سنبھالا اور سلیپروں کو سٹر پٹر گھسیٹتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

رات کو نفیسہ بانو کے بڑے بھائی چندا میاں اُن کے گھر آئے تو انھوں نے بہن سے دریافت کیا "نفیسہ! کیا آج چھجن بُوا سے تمھاری قمر آرا کے رشتے کے بارے میں کچھ بات چیت ہوئی تھی؟"

جواب میں نفیسہ بانو نے اپنی کٹوراسی آنکھیں پھیلا کر چند لمحوں تک خاموشی سے انھیں دیکھا۔ پھر فوراً ہی ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگنا شروع ہو گئے تو انھوں نے دوپٹے میں منہ کو چھپالیا اور سسکیاں بھرنے لگیں۔ بھائی نے سر پر ہاتھ پھیرا "اری پگلی اس میں رونے کی کیا بات ہے گھر میں بیری ہوگی تو گٹھیاں تو آئیں گی ہی۔" پھر گلے سے لگاتے ہوئے بولے "دیکھو اتنا مت سوچا اگر بیمار پڑ گئیں تو کیا ہوگا۔ ہم غریبوں کو تو روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینا ہوتا ہے۔ کام بند رکھنے سے گھر کا چولہا کیسے چلے گا؟ نفیسہ! ذرا سوچو تمھیں مفلسی کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔ بے شک ذرا عمر کا فرق ضرور ہے۔"

نفیسہ بانو تڑپ کر یوں غرائیں جیسے رِنگ ماسٹر نے اونگھتے ہوئے شیر کو چابک ماردیا ہو "بھائی صاحب! کیا آپ کو معلوم نہیں عادل بھائی قمر آرا کے والد سے بھی دو برس بڑے ہیں۔"

"ہاں تو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔" طیش میں نفیسہ بانو کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آگئیں۔

"آپ تو قیامت آجائے گی جب بھی یہی کہیں گے کچھ نہیں ہوا۔"

جواب میں چندا میاں جھلا کر بولے "یہ جو تم نے مہ پارہ کی بات طے کر رکھی ہے یہ لڑکا کون ساتیس مار خاں ہے۔ جانتی ہو... اس کے چال چلن کے لیے جب پوری برادری نے اس کو نہیں پوچھا تو انھوں نے تمھارے گھر کا رُخ کیا ہے اور اگر وقت پر جہیز وغیرہ کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا تو کیا کروگی ہے کچھ پاس پلّے؟ عمر بھر بیٹیوں کو کولھے سے لگائے رکھنا یا ایک دن صبح اُٹھ کر آنکھیں ملتے ملتے دیکھنا کہ وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ نفیسہ ابھی تو فاقے فقر سے کٹ رہی ہے لیکن ذرا آنے والے خوفناک دنوں کے بارے میں سوچو...؟ میں نے مانا تمھاری بیٹیاں خوبصورت ہیں، حسین ہیں لیکن میری بہن صورت کے ساتھ ساتھ لوگ کچھ اور بھی چاہتے ہیں جس میں مال دولت، عزّت، خاندان وغیرہ سب کچھ ہی شامل ہے۔ اس سماج میں غریب کی عزّت ہی کیا ہے اور وہ بھی گھر گھر گھوم کر کپڑے سینے والی کی؟

چندا میاں نے جذبات میں بھر کر سچ کا زہر ایک ہی سانس میں اُگل دیا جیسے کوئی مینڈک زہریلے سانپ کا من گھبرا کر اُگل دے اور اب روشنی ہی روشنی تھی جس سے نفیسہ بانو کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپا اور گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔

پھر چندا میاں یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے "تم اچھی طرح غور کر لو میں کل آؤں گا۔"

دوسرے دن جب چندا میاں بہن کے گھر پہنچے تو نفیسہ بانو منہ سر لپیٹے پڑی ہوئی تھیں۔ مہ پارہ اور قمر آرا دونوں سینے پرونے کے کام میں مصروف تھیں۔ بہن کو اٹھایا۔ حال پوچھا تو معلوم ہوا آج صبح سے چولھا نہیں جلا ہے۔ سب کو فاقہ ہے دونوں لڑکیاں کام مکمل کر رہی ہیں پیسے آئیں گے تو چولھا جلے گا۔ چندا میاں اُلٹے قدموں واپس ہو گئے۔ گھر سے کھانا لائے سب کو کھلایا۔ پھر بہن سے مخاطب ہوئے "تم اپنا دل چھوٹا مت کرو چھوڑو اس رشتے کی بات کو اپنا کام دھندا دیکھو اللہ مالک ہے وہ جیسا چاہے گا وہی ہوگا۔"

جواب میں نفیسہ بانو بہت سنجیدگی سے بولیں "ہاں بھائی صاحب اللہ جو چاہتا

ہے وہی ہوتا ہے یہ اللہ کی ہی مرضی ہے جو ہمارے گھر پیغام آیا ہے ورنہ بندے کی کیا مجال ہے۔ بندہ تو صرف سوچ سکتا ہے اور مقدر کے لکھے پر آنسو بہا سکتا ہے اور پھر جوڑے تو اسی کے یہاں بنتے ہیں۔ آپ حجن بُوا سے ملاقات کر کے تاریخیں مقرر کر لیجیے۔"

چندا میاں تو بہن کی بات سُن کر خوش خوش واپس چلے گئے لیکن نفیسہ بانو کے منہ کو چُپ لگ گئی۔ وہ پتھر کی مورتی بن گئیں کسی سے بات نہ چیت ہنسنا نہ رونا بس کام سے کام۔ پھر جب وداعی کا وقت آیا تو وہ دولہا سے دور ہی دور رہیں۔ آج عادل بھائی کا سامنا کرنے کی اُن میں ہمت ہی نہیں تھی۔ انھوں نے اندر کوٹھڑی میں ہی بیٹی کو گلے لگایا اور رخصت کے لیے حجن بُوا کے سپرد کر دیا اور جب ڈولا اُٹھا تو پتھر کی مورتی کا وجود ٹوٹ کر بکھر گیا اس کے منہ سے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں نکلنے لگیں۔ ساتھ ہی آتشیں لاوا آنکھوں کی راہ سے بہنا شروع ہوا تو رُکنے کا نام ہی نہیں تھا ہر کوئی اپنی اپنی کوشش کر کے تھک گیا تو ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے سکون کے لیے غنشی کا انجکشن لگا دیا۔

پھر وہ ایسی غافل ہوئیں کہ انھیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ ابھی دو بیٹیوں کے ہاتھ اور بھی پیلے کرنا ہیں۔

ارمان شمسی بنگلہ دیش میں اردو کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں اور اس زبان کو جلا بخش رہے ہیں۔ وہ وہاں ان معدودے چند شخصیتوں میں ہیں جنہوں نے افسانوی ادب کو ایک نئی سمت عطا کی اور زندگی کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا جن پر انسان کی نظریں کم ہی پڑتی ہیں۔ ان کے موضوعات اور فکر میں نیا پن ہے اور تحیّر برقرار رہتا ہے۔ بنگلہ دیش ہی میں نہیں بلکہ پورے برِ صغیر میں انہوں نے اپنے لیے ایک مقام بنالیا ہے اور اب تو وہ صاحبِ کتاب بھی ہو گئے ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

(پروفیسر) ظفر احمد نظامی

شعبۂ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی